مسلم دیش بھگت

لیکھک

رتن لال بنسل فیروز آبادی

چھپوانے والے ـــ
سکریٹری، ہندستانی کلچر سوسائٹی
۲۸، بائی کا باغ، الہ آباد

پہلی بار ۱۹۴۹

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

چھاپنے والے ـــ
حافظ محمد سلیم
سلیمی برقی پریس
الہ آباد

کہاں کیا؟

دیکھئے

کتاب کا نام دیکھ کر جب میں اٹکا تو ہو سکتا ہے، میری طرح اور بھی اٹکیں۔ دیش بھگت کے پیچھے ہندو مسلم کا پچھلا کیوں۔ دیش بھگت تو سچ مچ ہندو مسلم پنے سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ دیش بھگت ہونے کے لئے ایشور بھگت ہونا ضروری ہے اور ایشور بھگت ہندو مسلمان میں بھید کیوں کرے گا، اور وہ خود اس بھید کی کیچڑ میں کیوں پھنسے گا۔ ناستک یا منکر سمجھے جانے والے آدمی بھی سچے دیش بھگت ہو سکتے ہیں۔ پر ایسے آدمی تو ایشور بھگت سے ایک ہاتھ بڑھ کر ایماندار ہوتے ہیں۔ ہم ناستک دو طرح کے مانتے ہیں۔ ایک کو ہم ناستک ناستک اور دوسرے کو ناستک کہتے ہیں۔ ناستک ناستک تو ہم اُسے مانتے ہیں جو سچ مچ نہ ایشور کو مانتا ہے، نہ خدا کا قائل ہے، نہ پرلوک میں وشواس رکھتا ہے اور نہ انسانیت کا ہی پجاری ہوتا ہے۔ وہ تو دیش بھگت ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، کسی مطلب کے لئے دیش بھگتی کا ناٹک کھیل سکتا ہے۔ ناستک ہم اُسے

رکھتے ہیں تیور دکھانے کے لیے نہ مسجد سے غرض رکھتا ہے نہ مندر
مطلب۔ اُسے نہ نماز سے کچھ لینا نہ پوجا کو کچھ دینا۔ نہ قرآن کی
تلاوت نہ وید کا پاٹھ۔ وہ تو سرے پاؤں تک انسانیت میں ڈوبا
ہوا ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ اُسکے اندر کا خدا اُس میں جاگ
گیا ہوتا ہے۔ دوسرے شبدوں میں بھیتر بھیتر جس کے رام وہ ہرا آستک
اور جس کے باہر رام وہ لوگوں کی نظروں میں آستک۔ پر جس کے
بھیتر بھی رام اور باہر بھی رام اُسے ہم کہتے ہیں آستک آستک
جن دیش بھگتوں کی زندگی آپ کو اِس کتاب میں ملے گی وہ بھیتر
بھی خدا پرست تھے اور باہر بھی۔ یعنی آستک آستک تھے۔ اُنھیں
غلامی برداشت نہ تھی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ہندستان کے اکیلے
مسلمان کی آزادی اتنی ہی بے معنی بات ہے جیسے کسی آدمی
کے آدھے جسم کی آزادی۔ اسلیے اُنکی کوششیں کسی ایک فرقہ
کے لیے نہ تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی
آسانی کے خیال سے ہندستان کی آزادی کے لیے کسی ایک فرقے کو
ہی اوزار یا ہتھیار بنایا ہو۔ ہاں، تو پھر ایسے دیش بھگتوں کے
لیے مسلم یا ہندو نام سے پکارنا کانوں کو اچھا نہیں لگتا۔ پر ہندستان
کی اب تک کی ہوا اور آج تک کی ہوا مجبور کرتی ہے کہ کتاب کا نام
مسلم دیش بھگت ہی رہے۔ نہ صرف اِس وجہ سے کہ اِس میں اُن
دیش بھگتوں کا حال ہے جنھوں نے مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا،
نہ اِس وجہ سے کہ وہ دین اسلام کے قائل تھے بلکہ اِس وجہ سے کہ
مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد یہ جانتی ہی نہیں کہ وہ اپنوں میں سے

کتنوں کو دیش بھگتی کی ویدی پر قربان کر چکی ہے اور نہ ہندوؤں کو ہی یہ پتہ ہے کہ مسلمانوں میں کیسے کیسے ہونہار، جوان اور کیسے کیسے قابلِ وجود دیش بھگتی کی بل ویدی پر نچھاور ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھ کر ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایسا محسوس کریں گے، مانو وہ ہندستان کی تاریخ کو ایک نئے اور انوکھے روپ میں پڑھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے، اس کتاب کو پڑھتے پڑھتے مسلمانوں کی چھاتیاں پھول اٹھیں اور ہندوؤں کے دل سے مسلمانوں کے لئے اوچھے پن سے بھرا ہوا غبار آنکھوں کی راہ پانی بن کر نکل جائے۔

ہمارا دل یہی کہتا ہے کہ کتاب ہندو مسلمانوں کو پاس لانے میں بڑی مدد کرے گی اور دونوں کے دل دھو کر ایک دوسرے پر بھروسہ پیدا کرنے میں بڑی مدد ثابت ہوگی۔ یہ کتاب سب کے لئے تو ضروری ہے ہی، پر ہمیشہ ضروری بنے رہنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ دیش بھگتوں کی زندگیاں امر ہوا کرتی ہیں۔

پڑھئے اور پھر پڑھئے، اور سمجھ لیجئے کہ بات ویسی نہیں تھی جیسی آپ اب تک سمجھے ہوئے تھے۔ غلامی کے کانٹے کی دل میں ایک سی چبھن ہوتی ہے۔ اس چبھن کو دور کرنے کی ایک سی کوشش ہوتی ہے اور آزادی کے امرت کی مٹھاس ہر گلے کو ایک سی ہی لگا کرتی ہے۔

اب آپ آزادی کے چھپر تلے ہیں۔ اس جانکاری

میں آپ کو لطف ہی آئے گا کہ اس پتھر کے ادھر تک
پہنچنے میں کن کن کے ہاتھ لگے تھے۔

نئی دہلی
۵-۱-۴۹ء

بھگوان دین



حضرت شاہ ولی اللہ

ہمارے ملک میں ہندو اور مسلمانوں کے آپسی من مٹاؤ سے ملک کے جہاں اور بہت سے نقصان ہوئے وہاں ایک یہ بھی ہوا کہ بہت سے ایسے سنت، مہاتما اور ولی اللہ جنھوں نے بنا کسی بھید بھاؤ کے پورے ہندستان کو اونچا اٹھانے اور اُسے ترقی دینے کی کوششیں کیں، صرف اس لئے بھلا دیے گیے کہ وہ اِس یا اُس مذہب کے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ جن کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر سارا دیش آگے بڑھ سکتا تھا بہت سے بہت ایک مذہبی لیڈر بن کر رہ گئے۔

اٹھارویں صدی کے مسلمان دردیش شاہ ولی اللہ بھی ہمارے ملک کی ایک ایسی ہی زبردست ہستی تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے کے گرتے ہوئے اخلاق اور بگڑتے ہوئے چال چلن کو ہی اونچا اٹھانے کی کوشش کی، بلکہ اُس زمانے کی راج نیتی میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ بدیشی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندستان کو بچانے کے لیے وہ زندگی بھر لڑتے رہے اور اپنے خاندانوں، بیٹوں، ناتیوں اور ہزاروں شاگردوں کے دل میں ایسی آگ چھوڑ گئے کہ انھوں نے مر جانا پسند کیا، پر ہندستان کی غلامی کو چپ چاپ برداشت نہیں کیا۔ آئیے، آج جبکہ ہمارے ملک کی صدیوں سے سوئی ہوئی قسمت پھر کروٹیں لینے لگی ہے اور آسمان پر امید دلانے والے ستاروں کی چمک کچھ کچھ نظر آنے لگی ہے، ہم اپنے اس بزرگ کی پاک زندگی پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں۔

شاہ صاحب کی پیدائش

سترھویں صدی کے آخیر کے اس انقلابی دور میں، جبکہ اورنگ زیب کی حکومت کے خلاف جگہ جگہ بغاوتیں ہو رہی تھیں، دہلی کے ایک مشہور درویش گھرانے میں چار شوال سن گیارہ سو چودہ ہجری یعنی سنہ ۱۷۰۲ کے قریب بدھ کے دن شاہ ولی اللہ کا جنم ہوا۔ آپ کے پتا کا نام شاہ عبدالرحیم تھا۔ شاہ عبدالرحیم بہت بڑے عالم صوفی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہی دربار میں مولویوں کا بول بالا تھا۔ شاہ عبدالرحیم اگر چاہتے تو شاہی دربار میں رتبہ حاصل کر سکتے تھے، پر اُنھوں نے اسے اپنی فقیری شان کے خلاف سمجھا اور ہمیشہ شاہی دربار کے سایہ سے بھی بچتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے جب بھی ضرورت سمجھی نڈر ہو کر بادشاہ کے برے کاموں کو برا کہا اور حکومت کی بھولوں کو صاف صاف دکھایا۔

شاہ عبدالرحیم اورنگ زیب کی بھی نیک چلنی، پرہیزگاری اور سادہ زندگی کے قایل تھے، پر اس بات سے انھیں بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ کچھ کٹر مولویوں کے کہنے پر حکومت کی طرف سے ہندوؤں اور شیعوں کو صرف اس لیے ستایا جاتا تھا کہ وے ہندو یا شیعہ ہیں۔ اُن کے خیال سے یہ بات اسلام کی نصیحتوں اور اسلامی قانون کے خلاف تھی۔ ساتھ ہی انھیں ڈر تھا کہ اس طرح حکومت کے پائے کمزور پڑ جاویں گے، ملک میں جھگڑے کھڑے ہو جاویں گے اور ہندوستان کی ترقی رک جاوے گی۔ اورنگ زیب کی حکومت کے اس دور میں جبکہ مغل سلطنت کا سورج پورے چڑھاؤ پر تھا شاہ عبدالرحیم صاحب نے آنے والے خطروں کو صحیح صحیح پہچان لیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کو مذہبی تعصب سے اوپر اٹھ کر سوچنے اور سمجھنے کی عادت اپنے پتا سے ملی۔ پانچ سال کی عمر میں وہ اپنے پتا کے مکتب میں بیٹھے، سات سال کی عمر تک قرآن شریف پورا کیا۔ اس کے بعد تین سال تک وہ عربی کی مشہور کتاب "شرح ملّا جامی" پڑھتے رہے، اور پھر چودہ سال کی عمر تک اسلامی فلسفے کی اور کتابوں کو گہرائی سے پڑھا۔ چودہ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ کی شادی ہوگئی، ایک سال بعد اپنے پتا کی شاگردی میں وہ "سلوک" یعنی یوگ ابھیاس اور دل کی صفائی کی کوششوں میں لگ گئے۔ ابھی دو سال ہی بیتے تھے کہ شاہ عبدالرحیم چل بسے۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہی اپنے پتا کی گدی سنبھال کر شاہ ولی اللہ نے اپنے مدرسے میں پڑھانا شروع کر دیا۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالی اُنھوں نے دیکھا کہ کچھ سال پہلے اُن کے پتا نے حکومت کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر جو ہونہار بتائی تھی وہ سچ ثابت ہو رہی تھی۔ ملک میں جگہ جگہ بلوے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہندستان کی وہ ایکتا جسے اکبر بڑی کوششوں سے بنا پایا تھا خطرے میں تھی۔ اورنگ زیب دنیا سے سدھار چکا تھا۔ اس کے اُٹھتے ہی بہت سی آزاد حکومتیں صوبے صوبے میں بن گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے یہ بھی دیکھا کہ ملک کے ان آپسی جھگڑوں سے انگریز اور فرانسیسی اپنا مطلب سادھنے کی کوششیں کر رہے تھے اور کھلے عام اس ملک کی حکومت میں حصّہ لینے لگے تھے۔

حالت بہت نازک تھی، ملک کا ہر سردار، راجا یا نواب اپنی ہی بڑھوتی کی فکر میں تھا۔ ملک کی کسی کو بھی پرواہ نہیں تھی اپنے تھوڑے سے فائدہ کے لیے ان میں سے ہر ایک کوئی بھی کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ راجدھانی دہلی میں دن رات سازشیں چلتی رہتی تھیں اور قتل پھانسیوں اور لمبی سزاؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کچھ دنوں اس حالت پر وچار کرتے رہے، اس کے بعد دوسرے ملکوں کا حال جاننے کے لیے وہ حج کے واسطے مکہ گئے۔ وہاں دو سال رہے۔ زمانے کی حالت پر بڑے بڑے عالموں سے بحث کی زمانے کے مشہور عالم شیخ ابو طاہر سے ایک عرصے تک تعلیم حاصل کی۔ بعد کو ہندستان واپس لوٹ آگئے۔

یہاں آکر انھوں نے اپنے خیال پھیلانے شروع کیے۔ اُن کی رائے میں اس زمانہ کی ان تمام برائیوں کی جڑ میں دو خاص باتیں تھیں۔

(۱) یہ کہ ہندو یا مسلمان دونوں مذہب کے لوگوں میں وہ سچا مذہبی جذبہ نہ رہ گیا تھا جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے۔ اُلٹے اُن میں ایک طرح کی لامذہبی یا ناستکتا پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ اپنے یا اپنے گھرانے کے ہی فائدے نقصان کو ہی دیکھ سکتے تھے۔ اور سماج یا ملک کا بڑے سے بڑا فائدہ اپنے نجی فائدے کے اوپر قربان کر سکتے تھے۔

(۲) یہ کہ اوپر کے امیر امرا، رئیسوں اور سرداروں نے نیچے کے لوگوں پر اپنی عیش آرام کی زندگی کا اتنا بڑا بوجھ لاد دیا تھا کہ وہ یعنی دیس کے عام لوگ حیوانوں کی سی زندگی بتانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب اپنی ایک کتاب "حجۃ اللہ البالغہ"

میں لکھتے ہیں :۔

"اگر کسی قوم میں دھن دولت کی لگاتار ترقی جاری رہے تو اُس کی صنعت وحرفت (کلا کوشل) اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اسکے بعد اگر حکومت کرنے والی جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر (سج دھج اور گھمنڈ) کی زندگی کو اپنا معمول بنالے تو اُسکا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات (شریمیون) پر اتنا بڑھ جاویگا کہ سوسائٹی کا بڑا حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاویگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق (سماجی سداچار) اُس وقت برباد ہوجاتے ہیں، جب کسی جبر سے اُنکو اقتصادی (مالی) تنگی پر مجبور کر دیا جائے، اُس وقت لوگ گدھوں اور بیلوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لئے کام کرینگے اور جب انسانیت پر ایسی مصیبت آتی ہے تو خدا انسانیت کو اس مصیبت سے نجات (چھٹکارا) دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا (سجھاتا) ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرت الٰہیہ (ایشوری شکتی) انقلاب کے سامان پیدا کرکے قوم کے سر سے اس بیجا حکومت کا بوجھ اُتار دے"

ان جملوں کو پڑھتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تب تک یورپ میں نہ کارل مارکس پیدا ہوا تھا اور نہ سوشلزم (سماج واد) کی کوئی تحریک چلی تھی۔

شاہ ولی اللہ چاہتے تھے کہ عام لوگ آگے بڑھیں اور ہندستان میں ایک جمہوری (جنتانتی) حکومت قائم کی جائے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے (جوڑ ڈھیلے ہو چکے ہیں) اور مغلیہ سلطنت میں قیصر و کسریٰ (ایران و روم

کے سمراؤں) کی سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لیے مصلحت خداوندی (اللہ کی اِچّھا) یہی ہے کہ اس نظام کو سرے سے توڑ دیا جائے۔"

قرآن شریف کا ترجمہ

عام لوگوں میں بھی مذہبی زندگی لانے کے لیے شاہ صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں پڑھے لکھے مسلمان عربی کی نسبت فارسی بہت زیادہ جانتے تھے۔ دوسرے مذہبوں کے لوگ بھی فارسی بہت پڑھتے تھے۔ شاہ صاحب چاہتے تھے کہ فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کا اصلی سندیش عام لوگوں تک پہنچا دیں۔

جب سے قرآن شریف اس دنیا کو ملا تب سے یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا ترجمہ ایک دوسری زبان میں کیا جا رہا تھا۔ یہ کام ایک ایسا انقلابی کام تھا جس نے مسلمانوں میں ایک ہل چل پیدا کر دی۔ بہت سے ملاؤں نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن شاہ صاحب نے کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے مدرسے میں برابر اپنے اسی ترجمے کو پڑھاتے رہے۔ اپنے ترجمے میں انہوں نے قرآن کی آیتوں کی تشریح (ویاکھیا) کرتے ہوئے بھی پرانے ملاؤں کی رائے کے خلاف بڑے بڑے انقلابی اور نئے معنی کیے۔

قتل کی سازش

حکومت کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ شاہ ولی اللہ ملک میں ایک سیاسی انقلاب کرانا چاہتے ہیں۔ ایک دن شام کو جب شاہ صاحب اپنے تھوڑے سے شاگردوں کے ساتھ دلی کی مسجد فتحپوری میں

نماز پڑھ رہے تھے کچھ لوگوں نے آکر انھیں گھیر لیا۔ شاہ صاحب نے دوسرے دروازے سے نکل جانا چاہا۔ جب اُس دروازے کو بھی گھرا ہوا پایا تو انھوں نے پوچھا کہ آخر آپ لوگ کیوں میرے خون کے پیاسے ہیں؟ جواب ملا کہ ہم مولوی ہیں تم نے یہ ترجمہ لکھ کر ہماری روٹی اور عزّت دونوں پر اور خود قرآن پر حملہ کیا ہے۔ شاہ صاحب نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، جب وہ نہ مانے تو اُن کے شاگردوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں۔ کسی طرح شاہ صاحب کی جان بچ گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حملہ حکومت کی سازش سے ہوا تھا، کیونکہ شاہ صاحب کی نصیحتوں اور اُپدیشوں میں حکومت کو اپنی موت نظر آنے لگی تھی۔

شاہ صاحب کی اور کتابیں

اس ترجمے کے بعد شاہ ولی اللہ نے قریب تیس کتابیں اور لکھیں جن میں اُنھوں نے اپنے انقلابی پروگرام کو بیان کیا ہے۔ ان کتابوں سے شاہ صاحب کے سیاسی خیالوں پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ بہت بار تو یہ دیکھ کر دنگ رہ جانا پڑتا ہے کہ آج جن اُلجھنوں میں ہمارا ملک پھنسا ہوا ہے اُن پر ہمارے اس دور تک دیکھنے والے درویش نے کتنی قابلیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

شاہ صاحب کے تین خاص اُصول

شاہ صاحب کی کتابوں سے اُن کے تین خاص اُصولوں کا پتہ چلتا ہے۔

پہلا یہ کہ وہ ہندستان کو ایشیا کا ایک طاقتور ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی رائے میں، یہ تبھی ہو سکتا تھا، جب یہ پورا ملک کسی ایک حکومت کے آدھین ہو۔ اُنھوں نے اپنی کتاب " بدور بازغہ " میں لکھا ہے کہ ملک میں چھوٹے چھوٹے خود مختار راج بھلے ہی ہوں، لیکن اُن کا ایک فیڈریشن ہونا چاہیے، جس میں کسی بھی مسئلے پر پورے ہندستان کا فائدہ نقصان نگاہ میں رکھ کر غور کیا جا سکے۔ فیڈریشن کے لیے انھوں نے " ارتفاق " لفظ استعمال کیا ہے۔ انھیں اکبر کے زمانہ کا ہندستان اچھا لگتا تھا، لیکن ان کا منشا اکبری سامراج کو پھر سے زندہ کرنا نہیں تھا۔ وہ سارے ملک میں ایک ایسی جمہوری یعنی جنتا کی حکومت چاہتے تھے جس میں چھوٹے بڑے، غریب امیر سب برابر کا حصہ لے سکیں۔

دوسرے وہ ہندستان بھر میں ہندو مسلمان اور سب کیلئے ایک ہی قسم کا قانون چاہتے تھے جس کی پابندی ہر مذہب کے لوگ کر سکیں۔ اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ۔ " اس کو نکاح کی مثال سے سمجھنا آسان ہوگا۔ 'نکاح' کی رسم کا مطلب صرف یہ ہے کہ سماج کو ایک عورت اور ایک مرد کے بیچ شوہر اور بیوی کے سمبندھ پیدا ہو جانے کا پتہ چل جائے پھر چاہے یہ کام باجے بجا کر، گیت گا کر، آگ کے سامنے کیا جائے یا کسی قاضی کے سامنے رسم پوری کی جائے، نکاح کا مقصد دونوں ہی طرح سے پورا ہو جاتا ہے۔ نکاح کو صرف اس کی پابندی سے مطلب ہے، رسموں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

تیسری بات جس پر انھوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ تھی

کہ سب طرح کے مزدور پیشہ اور کاریگر لوگوں کو اُن کے صحیح حق دلائے جاویں اور ان پر کم سے کم بوجھ رکھا جائے۔ اسی مسئلے پر انھوں نے سب سے زیادہ لکھا ہے اور مغل سلطنت کے گرنے کی خاص وجہ یہی بتائی ہے۔ وہ ایک ایسی حکومت چاہتے تھے جس میں کسی بھی آدمی کو اپنی زندگی کی ضرورتوں کے لئے ترسنا نہ پڑے۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے۔ "الغرض انسانوں کی اجتماعی (ملی جلی) زندگی کے لئے اقتصادی توازن (آرتھک یعنی مالی برابری) ایک ضروری بات ہے۔ ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام (آرتھک پربندھ) کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگوں کی زندگی کی سب ضرورتوں کا کفیل (پورا کرنے والا) ہو۔ جب لوگوں کو اپنی اقتصادی (مالی) ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں، جو اُنکے پاس کسب معاش (روزی کمانے) کے بعد بچ رہتا ہے، زندگی کے اُن شغلوں (کاموں) کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں (دھیان دیتے ہیں) جو انسانیت کے اصل جوہر ہیں۔"

شاہ صاحب ان معاملوں میں پکے سوشلسٹ یعنی سامواوی تھے کمیونسٹ مینی فیسٹو نکلنے سے یہ قریب سو برس پہلے کی بات ہے۔

عمل کے میدان میں

اپنی کتابوں اور تقریروں سے پرچار کرنے کے بعد اپنے ان خیالوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۵ مئی سنہ ۱۸۳۱ء کو انھوں نے باقاعدہ ایک جماعت بنائی جس کا مقصد ہندستان میں

ایک سیاسی انقلاب کرنا تھا۔ اس جماعت کے چار اصول تھے (۱) خدا پرستی یعنی ایشور کی پوجا (۲) انصاف (۳) تربیت نفس یعنی اپنے پرتر کو ٹھیک کرنا اور (۴) ضبط نفس یعنی سنیم۔

اس جماعت کا نام "جمعیتہ مرکزیہ" یعنی "سنٹرل کمیٹی" رکھا گیا اور ملک کے سب حصوں میں اس کی بہت سی شاخیں قائم کی گئیں۔ ان شاخوں میں نجیب آباد کا مدرسہ، بریلی میں شاہ علم اللہ کا تکیہ اور سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں ملا محمد معین کا مدرسہ خاص تھے۔

ان شاخوں کے ذریعے سارے ملک میں شاہ ولی اللہ کے خیالوں کا پرچار کیا گیا۔ شاہ صاحب کے خاص شاگردوں میں مولانا محمد حسین پھلتی، مولوی نور اللہ بڈھانوی اور مولانا محمد امین کشمیری نے پرچار کا کام اپنے اوپر لیا، اور امیروں غریبوں ملا مولویوں اور عام لوگوں سب میں ایک بیداری پیدا کردی۔ کچھ مسلمانوں نے یہ اعتراض اٹھایا کہ جب سکھ اور مرہٹے مسلمانی حکومت پر حملہ کر رہے ہیں، اور انھوں نے ایک مذہبی جنگ چھیڑ رکھی ہے اب ایسی حالت میں ان خیالوں کا پرچار کرنا ایک مسلمان کے لئے کہاں تک جائز ہے؟ اس اعتراض کے جواب میں شاہ صاحب نے کہا کہ ـــ "کوئی بھی حکومت صرف اس لئے اسلامی حکومت نہیں ہو جاتی کہ اس کا بادشاہ مسلمان ہے۔ اس کے خلاف انصاف کے سہارے چلنے والی کوئی ایسی حکومت بھی اسلامی حکومت ہو سکتی ہے جس کا بادشاہ مسلمان نہ ہو"۔

دھیرے دھیرے یہ سنگٹھن اتنا مضبوط ہوتا گیا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے لفظوں میں ـــ "شاہ صاحب کی اس جماعت نے

باقاعدہ ایک عارضی حکومت (کام چلاؤ سرکار) قائم کرلی۔ اس وقت شاہ صاحب کے کچھ شاگردوں نے حکومت کے خلاف تلوار اٹھانے پر زور دیا، شاہ صاحب نے انھیں منع کردیا اور سمجھایا کہ جس طرح حضرت محمد نے تیرہ سال تک عدم تشدد یعنی آہنسا کے سہارے اپنا پرچار کیا یہاں تک کہ خود ہجرت کرگئے لیکن تلوار ہاتھ میں نہ لی، اسی طرح ہمیں بھی چپ چاپ اپنے وچاروں کو پھیلانے کا کام کرتے رہنا چاہیئے جب تک کہ اس انقلاب کی ہم پوری تیاری نہ کرلیں۔ کچھ دن بعد دہلی کے ایک حاکم نجف علی خاں نے شاہ صاحب کے ہاتھوں کے پنجے اتروادیے، تاکہ وہ لکھ کر اپنا پرچار نہ کرسکیں اور اُن کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سلطنت سے باہر نکلوا دیا۔ شاہ صاحب اس ظلم کو ہنستے ہنستے سہہ گئے اور انھوں نے اسکے خلاف اُف تک نہ کی۔

آخر ۱۷۶۲ء میں اپنی جماعت کا تمام بوجھ اپنے بیٹے شاہ عبدالعزیز پر رکھ کر وہ اس دنیا سے بدا ہوگئے۔ جس ہندستان کی انھوں نے کلپنا کی تھی، اُسے وہ اپنی آنکھوں نہ دیکھ سکے اور جس انقلاب کی انھوں نے نیو ڈالی تھی اُسے بھی دیکھنا انھیں نصیب نہ ہوا، پھر بھی ہندستان میں وہ ایک ایسی جماعت قائم کرگئے، جس نے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اپنے کو بدل کر ہندستان کو ایک ہرا بھرا گلستاں بنانے کی کوششوں میں پورا حصہ لیا اور آج قریب دوسو سال بعد بھی وہ نہ صرف زندہ رہنے بلکہ ہمارے ملک کی جنگ آزادی میں "جمعیۃ العلماء ہند" کی شکل میں ایک خاص جگہ رکھتی ہے۔ شاہ ولی اللہ سے لیکر مولانا حسین احمد مدنی تک کا یہ سلسلہ ایک ایسی تاریخ ہے، جس کا

چپہ چپہ شہیدوں کے خون سے لال ہے۔ اور جس پر ہمارا ملک جتنا بھی گھمنڈ کرے تھوڑا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے کل ساٹھ برس کی عمر پائی۔ اُن کے ساتھ نہ کسی راجا یا نواب کی طاقت تھی اور نہ وہ خود گھر کے کچھ زیادہ آسودہ تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے درویش تھے، جن کی دولت اُس کی دل کی سچائی اور فقیری ہوتی ہے۔ اُن دنوں دلّی کی ہر صبح ایک نئے انقلاب کا پیغام لے کر آتی تھی۔ اپنے اس چھوٹے سے زمانے میں انھوں نے دہلی کے تخت پر دس بادشاہوں کو بیٹھتے گرتے دیکھا۔ سادات بارہ کا تسلط، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں قید میں مرنا، طورانی امراؤں کے ہاتھوں سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور عروج، سکھوں کی بغاوت، نادر شاہ کا حملہ، دہلی کا قتل عام، محمد شاہ ابدالی اور پانی پت کی جنگ، سیاست ہند میں رہیلوں کی شرکت، ہندستان میں یوروپیوں کا لالچ بھر بنگال اور بہار میں انگریزوں کا عمل دخل، یہ تمام باتیں شاہ صاحب کی آنکھوں کے آگے سے گذری تھیں، پھر بھی اس بات پر اچرج ہوتا ہے کہ ملک کی بدقسمتی کی اُن کالی گھڑیوں میں جب بدیشیوں کی غلامی کی زنجیریں دنوں دن کڑی ہوتی جا رہی تھیں، کیسے اُن کی اُمیدوں کا چراغ آخیر تک اس شان سے جلتا رہا۔

شاہ صاحب کو اس دنیا سے گئے قریب قریب دو سو برس ہو گئے جس تحریک کی وہ نیو ڈال گئے تھے، وہ آج بھی جیوں کی تیوں قائم ہے۔ اُنکے پیچھے آنے والوں نے اُس پر کون کون سی عمارتیں کھڑی کی ہیں کاش! ہم سب اپنے فرقہ وارانہ تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر ہی اس عظیم الشان بزرگ ہستی کو پہچان پاتے۔

شاہ عبدالعزیز

سنہ ۱۷۶۲ میں، جب شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی تحریک جو عام لوگوں کا راج یا آجکل کی زبان میں سوشلسٹ ڈیموکریٹک حکومت قائم کرنے کی تحریک کہی جاسکتی تھی، اپنا بچپن پار کرکے جوانی میں قدم رکھتی جارہی تھی، شاہ صاحب دنیا سے چل بسے۔ اُن کے بعد شاہ صاحب کے بیٹے شاہ عبدالعزیز اپنے باپ کی جگہ اس تحریک کے دوسرے امام یعنی نیتا چنے گئے۔

شاہ عبدالعزیز اس وقت ۱۷ سال کے تھے۔ وہ صرف اسی لئے امام نہیں چُنے گئے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے بیٹے تھے، بلکہ اسلئے کہ پچھلے دو سال سے وہ بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس تحریک کے کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹا رہے تھے اور بڑی ذمہ داری سے اپنے مدرسے میں تعلیم دے رہے تھے مولانا محمد عاشق پھُلتی، مولانا محمد امین کاشمیری اور مولوی نور اللہ بڑھانوی جیسے ولی اللہ صاحب کے ساتھیوں تک نے اسی بات پر زور دیا کہ شاہ عبدالعزیز ہی امامت کے اس کانٹوں بھرے تاج کو سنبھال سکتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کی قابلیت کے بارے میں مشہور ہے کہ فارسی اور عربی کی بہت سی کتابیں اُن کی زبان پر تھیں اور ضرورت

پڑنے پر ان میں سے کام کی باتیں اور لمبی لمبی عبارتیں وہ زبانی بول کر لکھوا دیا کرتے تھے۔ طالب علموں کے ساتھ ان کا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ جو ایک بار اُن کے پاس آگیا اس کا مدرسہ چھوڑ کر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مذہبی بھید بھاؤ اُن میں نہیں تھا۔ اُن کے ایک براہمن دوست کبھی کبھی ہفتوں اُن کے ساتھ رہتے، اور اُن کے گھر پر ہی پوجا پاٹھ کرتے، سورج کو جل چڑھاتے، وید پاٹھ کرتے، پر شاہ صاحب کے گھر اُن کو کبھی کوئی دقت نہ ہوتی۔ مذہبی اُپدیش دیتے وقت بھی وہ اس بات کا بے حد خیال رکھتے تھے کہ کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو کسی کے بھی دل کو دکھا دے۔

ایسی اچھی فقیری طبیعت اور دوسروں کے دل نہ دکھانے کا اتنا خیال رکھتے ہوئے بھی شاہ صاحب کو اُس زمانہ کی سرکار اور کٹر پنتھی لوگوں کی طرف سے زندگی بھر کڑی مخالفت اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُنھیں دو بار زہر دیا گیا۔ ایک بار چھپکلی کا اُبٹن اُن کے بدن سے ملوا دیا گیا جس سے اُنھیں کوڑھ کی بیماری ہو گئی۔ اس کے بعد بھی جب اُن کے دشمنوں نے دیکھا کہ وہ اپنے اصولوں پر جیوں کے تیوں قائم ہیں اور اُسی جوش اور دلیری کے ساتھ اپنی تحریک پھیلا رہے ہیں تو پھر حکومت کی طرف سے اُن کو دلی سے دیش نکالا دیا گیا۔ حکم ہوا کہ دلی سے باہر ایک خاص حد تک وہ کسی سواری کا استعمال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں جون پور تک پیدل جانا پڑا۔ راستے میں لو لگنے سے ہمیشہ کے لیے اُن کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔

یہ تمام سختیاں شاہ عبدالعزیز ہنستے ہنستے جھیل گئے۔ وہ جانتے تھے کہ انقلاب کا راستہ ان تکلیفوں اور پریشانیوں کے جھاڑ جھنکھاڑوں میں ہوکر ہی جاتا ہے۔ صبر کے ساتھ اُن کو برداشت کرلینے سے ہی کامیابی مل سکتی ہے...

دیش نکالے کے زمانے میں شاہ صاحب نے کتنی ہی کتابیں لکھیں ان میں اُن کتابوں کا تفصیل وار جواب تھا جو اس عرصہ میں شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن کی جماعت کے خلاف لکھی گئی تھیں۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور 'تحفہ اثنا عشریہ' ہے۔ یہ فارسی میں ہے۔ دوسری ہے 'تفسیر فتح العزیز' جس میں شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب 'تفسیر فتح الرحمان' کی باتوں کو بڑے پھیلاؤ کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 'بستان المحدثین' (حدیث پڑھانے والوں کا حال) 'شرح میزان منطق' (منطق یعنی ترک پر) 'عجالہ نافعہ' (حدیث کے اصول) وغیرہ اور بھی بہت سی ایسی کتابیں لکھیں جو عربی فارسی کے ساہتیہ میں شاہ صاحب کا نام ہمیشہ روشن رکھیں گی۔

دیش نکالے کی میعاد ختم ہوتے ہی شاہ صاحب پھر دلی آ موجود ہوئے اور تعلیم دینے کا کام شروع کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نئے نئے پیروں اور بدعتیوں یعنی اپنے مطلب کے لئے نئے نئے اُصولوں کو گڑھ کر اُن کو ہی مذہبی فرض قرار دینے والوں کا زور تھا۔ ایک بزرگ کا کہنا ہے — "شہر بھر کے گنڈے اور بدمعاش کلے رکھائے، رنگین کپڑوں میں سجے دھجے صوفی بنے گھومتے تھے۔ معمولی آدمی ہی نہیں شاہزادے اور شاہزادیاں

بھی اُن کا مرید یا چیلا ہونا اپنے لئے ایک بڑی بات سمجھتے تھے۔ اُن لوگوں کی ہمت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ اُن میں سے کوئی کوئی مسجد کے ملاؤں کے پاس جا کر کہتے۔ "لے مسجد کے مینڈھے! لا ہمیں کچھ دے۔ آج ہمیں ...... جاتا ہے" اور بیچارے ملا کو اپنی جان چھڑانے کے لئے کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا تھا۔"*

راج کا یہ حالت یہ تھی کہ خاص دہلی میں ایک انگریز ریزیڈنٹ رہنے لگا تھا، جو کبھی خوشامد سے، کبھی لالچ سے، اور کبھی کبھی لال آنکھیں دکھا کر اُس وقت کے کمزور مغل بادشاہ سے من چاہے کام کرا لیا کرتا تھا۔ بنگال بہار کی دیوانی یعنی وہاں کی مال گزاری وصول کرنے کا اختیار انگریز کمپنی کو سونپا جا چکا تھا اور وہاں کے لاکھوں گھرانے کمپنی کی ظالم حکومت کے نیچے دبے دبے کراہ رہے تھے۔ باقی ہندستان میں بھی ایک دو ہندستانی حکمرانوں کو چھوڑ کر سب کے سب راجے نواب انگریزوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنے ہوئے بے شرمی کے ساتھ ایک دوسرے پر غرّاتے رہتے تھے۔

یہ حالت برداشت کی حد پار کر چکی تھی اور ضروری ہو گیا تھا کہ قلم اور زبان کے ساتھ ساتھ تلوار کا بھی سہارا لیا جائے۔ پر اُس وقت شاہ صاحب کی جماعت کی بساط ہی کتنی تھی! پھر بھی چپ بیٹھ سکنا مشکل تھا۔

شاہ صاحب نے اس کے لئے پہلا کام یہ کیا کہ ہندستان کی

---

* "علمائے ہند کا شاندار ماضی"

اُن سب جگہوں کو، جہاں آزاد اسلامی حکومت نہیں تھی۔ دارالحرب قرار دیدیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان جگہوں میں رہنے والے ہر مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہوگیا کہ یا تو وہ حکومت کے خلاف تلوار اٹھائے یا اُس جگہ کو چھوڑدے۔ اس زمانے کی حالت میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اور وہ بھی ایک ایسے معمولی فقیر کے لئے جو اپنے پیچھے صرف تھوڑے سے مرید رکھتا ہو، خود کوڑھ کی بیماری میں گرفتار ہو، آنکھوں کی روشنی جاچکی ہو، جس کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہلنے جلنے میں بھی کسی دوسرے آدمی کا محتاج ہو۔

شاہ عبدالعزیز صاحب یہ فتویٰ دے کر ہی نہیں بیٹھ گئے، انقلاب کی فوجی تیاریوں کے لئے انھوں نے باقاعدہ ایک "بورڈ" بنایا۔ جس کے صدر شاہ صاحب کے شاگرد سید احمد صاحب بریلوی اور ان کے نائب شاہ صاحب کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل اور شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحیٔ بنائے گئے۔ اُس بورڈ نے جنتا کو ملک کا اصلی حال بتانے اور اس کے خلاف لڑنے کے واسطے رنگروٹ بھرتی کرنے کے لئے ہندستان کے الگ الگ حصّوں کا دورہ شروع کیا۔ اپنے کام میں اس بورڈ کو نہایت کامیابی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ جہاں بھی پہنچتے تھے، اُسی جگہ ہزاروں مسلمانوں کی بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی، وہ لوگ سید احمد صاحب کی بیعت کرتے تھے یعنی ان کو اپنا گرد مان لیتے تھے اور ملک و مذہب کے لئے جان دینے کی قسم کھاتے تھے۔

گھومتے گھومتے جب یہ بورڈ رام پور پہنچا تو وہاں کے کچھ افغانوں نے سید صاحب سے شکایت کی کہ پنجاب کی سکھ حکومت انگریزوں سے مل رہی ہے۔ سید احمد صاحب پر اس کا بڑا اثر پڑا اور انھوں نے سب سے پہلے سکھوں سے سلجھ لینے کا ارادہ کیا۔ اُس دن سے انکی ملکی آزادی کی تحریک کچھ دنوں کے لئے ایک فرقہ وارانہ تحریک بن گئی۔

اس تحریک کے سکھوں کی طرف مڑتے ہی انگریز جو آج تک اُس جماعت کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اُلٹے اُس کے حامی بن گئے اب جہاں جہاں سید صاحب جاتے، وہاں وہاں انگریز اُن کی آؤ بھگت کرتے۔ کانپور میں تو کسی انگریز کی بیوی باقاعدہ سید صاحب کی مریدنی اور اُس نے کئی ہزار روپیہ اُن کی اور اُن کے کئی سو ساتھیوں کی خاطرداری میں خرچ کئے۔ یہاں پر یہ نہ بھول جانا چاہئے کہ سید صاحب جس سکھ حکومت کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے تھے اُس کا راجا رنجیت سنگھ انگریزوں کا بہت گہرا دوست تھا۔ دوست ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کو اُس کی طرف سے بڑا ڈر رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف تو انگریز راجا رنجیت سنگھ کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف اُس کی حکومت کے خلاف ان تیاریوں کو نہ صرف چپ چاپ برداشت کر رہے تھے، بلکہ اُس میں طرح طرح کی مدد پہنچا رہے تھے۔ اصل میں انھیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی تھی کہ جس جماعت سے انھیں اتنا بڑا خطرہ تھا وہ اب اپنے ہی ایک دیش باسی سے ٹکرانے جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو، یعنی سکھ حکومت کی جیت

ہو یا دشمن کامیاب رہے ۔ انگریز دونوں طرح اپنا فائدہ سمجھے ہوئے تھے۔
اتنے ہی میں سید صاحب ایک بڑے جتھے کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے۔ سکھوں سے انکی ٹکر رک گئی۔

حج کے لئے روانہ ہونے کے لگ بھگ دو سال بعد یعنی سنہ ۱۸۲۴ میں شاہ عبدالعزیز کا ایک معمولی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ اس وقت آپ کی عمر اسیؔ سال کی تھی۔ جب تک جیئے اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق اپنے ملک کو بدیشیوں کے اثر سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے رہے اسی خیال سے آپ نے سید احمد صاحب کو نواب امیر خاں پنڈاری کے لشکر میں داخل کرایا۔ یہاں وہ گھوڑ سوار فوج کے ایک اونچے عہدہ دار رہے۔ بعد میں امیر خاں نے جب انگریزوں سے صلح کرلی اور سید صاحب کے بار بار کہنے پر بھی انگریزوں کے خلاف لڑنا منظور نہ کیا تو سید صاحب وہاں سے الگ ہوکر شاہ صاحب کے پاس چلے آئے۔ امیر خاں کی نوکری چھوڑتے وقت آپ نے شاہ صاحب کو لکھا تھا کہ نواب صاحب اب انگریزوں کے ساتھ مل گئے ہیں اس لئے یہاں رہنا فضول ہے۔ اسی لئے میں نے انکی نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔

شاہ صاحب اور سید احمد صاحب کسی بھی طرح انگریزوں کو ہندستان میں ٹکنے دینا نہیں چاہتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کر گئے تھے کہ میرے کفن دفن میں ذرا بھی شان شوکت سے کام نہ لیا جائے۔ وہ ہمیشہ موٹی دھوتر کا کرتہ اور کھدر کا پائجامہ پہنا

تہ بند پہنتے تھے اور اپنے کفن کے لئے بھی کھدر ہی کی وصیت کر گئے تھے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے ایک بڑی بات جو اُن کے دل کا سچا پتہ دیتی ہے یہ کہی تھی کہ میرے جنازے میں شریک ہونے کی دعوت بادشاہ کو نہ دی جائے۔

یہ سب کیا گیا، پھر بھی جس شان شوکت کے ساتھ دلی میں جنتا نے اپنے اس سچے رہبر اور جاں نثار کو دفن کیا وہ بادشاہوں کو بھی نصیب ہونا مشکل ہے۔ بھیڑ اتنی تھی کہ جنازے کی نماز پچپن مرتبہ پڑھی گئی۔

اس طرح ملک میں عام لوگوں کی حکومت قائم کرنے کے لئے اٹھنے والی اس جماعت کا یہ دوسرا امام بھی اپنی زندگی کا ایک ایک پل اسی فکر اور کشمکش میں بتا کر موت کی گود میں سو گیا۔

شاہ محمد اسحاق

شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی تحریک کو کاغذ قلم اور بحث مباحثہ سے نکال کر بہت کچھ سپاہیانہ لباس پہنا دیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۴ء میں شاہ عبدالعزیز اس دنیا سے چلدیے اور شاہ محمد اسحاق اس تحریک کے تیسرے امام بنائے گئے۔ رشتے میں وہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے دھیوتے تھے، شاہ محمد اسحاق کا سارا پڑھنا لکھنا اپنے نانا کے مدرسے میں ہی ہوا تھا، اسی لئے ابھی جب تک اُن کے منہ سے ماں کے دودھ کی گندھ بھی اچھی طرح نہیں گئی تھی تبھی سے وہ اپنے بڑے نانا شاہ ولی اللہ کے مشن اور اس کے اصولوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اُن اُصولوں کے پرچار کے سلسلے میں اُن کے نانا شاہ عبدالعزیز صاحب کو جو جو تکلیفیں جھیلنی پڑی تھیں وہ بہت کچھ شاہ محمد اسحاق نے اپنی آنکھوں دیکھی تھیں۔ اُنکی طبیعت پر اس کا بہت بڑا اثر تھا۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے دھیوتے کو چھوٹی عمر سے ہی پہچان لیا تھا وہ سمجھ گئے تھے کہ اُن کے بعد اُن کی تحریک کو چلانے کے لئے سب سے زیادہ ٹھیک نیتا محمد اسحاق ہی ہو سکتے تھے۔ فوجی سنگٹھن کے لئے انھوں نے سید احمد صاحب کی صدارت میں مولانا عبدالحئی اور شاہ اسمٰعیل صاحب کا ایک فوجی بورڈ بنایا، اُس کے ساتھ ہی تمام غیر فوجی کاموں جیسے پرچار وغیرہ کے لئے، ایک دوسرا بورڈ بنایا، جس کے صدر شاہ محمد اسحاق صاحب تھے۔ اس طرح اپنی زندگی میں ہی انھوں نے اپنے

پیارے دمیوتے کو ملک کے لئے ایک ایسی جماعت کی سرداری کا کانٹوں بھرا تاج پہنا دیا جسے انگاروں سے بھرے راستے سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔

۱۸۲۳ء میں شاہ محمد اسحاق صاحب نے اس انقلابی تحریک کی کمان ہاتھ میں لی۔ دہلی کے شاہی تخت پر اس وقت سمراٹ اکبر شاہ تھے پر وہ نام ہی کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ ہندستان کے اصلی مالک ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ اور دہلی کے دربار میں کمپنی کا ریذیڈنٹ چارلس مٹکاف تھے۔ مٹکاف نے اپنے گھمنڈ بھرے برتاؤ اور گستاخیوں سے بادشاہ کے ناکوں دم کر رکھا تھا۔ یوں تو کچھ دنوں پہلے سے دہلی کی بادشاہت کمزور ہوتی جارہی تھی پھر بھی ہندستان میں رہنے والے انگریز افسر کم سے کم دکھاوے کے لئے بادشاہ کے ساتھ عزت کا برتاؤ کرتے تھے اور اپنے کو ان کی رعایا ظاہر کرتے تھے، لیکن لارڈ امہرسٹ اور چارلس مٹکاف نے اس پردے کو بھی اتار کر پھینک دیا۔ اس سے پہلے دہلی کے دربار میں رہنے والا ہر انگریز ریذیڈنٹ اور سب درباریوں کی طرح بادشاہ کو "تسلیم، کورنش اور مجرا" کیا کرتا تھا اور شاہی خاندان کے ہر بچے کی مناسب عزت کرتا تھا۔ لارڈ امہرسٹ کی شہ پاکر چارلس مٹکاف نے اس پرم پرا کو بدل دیا اور بھرے دربار میں ایسی حرکتیں کرنی شروع کردیں جو بادشاہ کی شان اور عزت میں بٹہ لگانے والی تھیں۔ انگریزوں کی ہمت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ بادشاہ اکبر شاہ نے جب اپنے ایک بیٹے مرزا سلیم کو اپنا ولی عہد بنانا چاہا تو انگریزوں نے اسے الہ آباد بھیج کر نظر بند کر دیا۔ اس

کے بعد جب بادشاہ نے اپنے دوسرے بیٹے نیلی کو اپنے بعد تخت کا حقدار بنانا چاہا تو انگریزوں نے اُس کی بھی مخالفت کی۔ ان باتوں سے تنگ آکر بادشاہ نے راجا رام موہن رائے کو اپنا ایلچی بنا کر ولایت بھیجا اور برٹش پارلیمینٹ سے انصاف پانے کی کوشش کی، پر راجا رام موہن رائے کو بھی ناامید لوٹنا پڑا۔ انگلستان کے حاکموں نے راجا رام موہن رائے کی ایک نہ سُنی۔

جو حالت دہلی کی تھی، ٹھیک وہی حالت باقی ہندستان کی تھی۔ آئے دن ہندستان کی ریاستوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر کسی نہ کسی راجا یا نواب کے گلے میں کمپنی کی غلامی کا طوق ڈال دیا جاتا تھا، اور جو مخالفت پر ڈٹ جاتا اُسے برباد کر دیا جاتا تھا۔ عام لوگوں کے ساتھ انگریزوں کے برتاؤ کی یہ حالت ہو چلی تھی کہ کہیں کہیں وہ اپنے سامنے کسی ہندستانی کا گھوڑے پر چڑھ کر نکل جانا بھی برداشت نہیں کرتے تھے، اور جگہ جگہ خاص کر کمپنی کی فوجوں کے اندر لوگوں کے مذہبی و سماجی معاملوں میں بھی دخل دینے لگے تھے۔

انگریز پادری کھلے عام ہندو مسلمانوں کے اوتاروں اور پیغمبروں پر چھینٹے کستے تھے۔ ۲۲ر مارچ ۱۸۳۲ء کو پارلیمینٹ کی سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے گواہی دیتے ہوئے کپتان ٹی میکن نے کہا تھا: "بہت سے عزت دار ہندستانی مسلمانوں نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ گورنمنٹ عیسائی پادریوں کے ساتھ بڑی رعائتیں کرتی رہی، اور یہ پادری لوگ اُن کے مذہبی رواجوں کو بُرا کہنے اور بزرگوں کو گالیاں دینے تک کی حد تک پہنچ جاتے ہیں" انہیں سے ایک

پادری ہندو مسلمان جنتا میں تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: "تم لوگ حضرت محمد کے ذریعے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہو، لیکن حضرت محمد اس وقت × × × میں ہیں اور اگر تم لوگ ان کے اصولوں پر یقین کرتے رہوگے تو تم سب بھی × × × میں جاؤگے"

یہ اُس وقت کے ہندستان کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔

شاہ محمد اسحاق صاحب کو امامت کی گدی سنبھالے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ سید احمد صاحب بھی حج سے واپس آگئے۔ انھوں نے بھی شاہ محمد اسحاق صاحب کو اپنا پیشوا مانا۔ جب کبھی مدرسے کے اندر کوئی جلسہ ہوتا تھا، تو صدارت کی چوکی پر شاہ محمد اسحاق بیٹھتے تھے اور سید احمد صاحب نیچے بیٹھتے تھے، اور جب کوئی فوجی یا جنگی بحث ہوتی تھی خاص کر مدرسے سے باہر، تو فوجی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے سید احمد صاحب صدارت کرتے تھے اور محمد اسحاق صاحب نیچے بیٹھتے تھے۔ مطلب یہ کہ گو سید احمد صاحب عمر میں بڑے تھے پھر بھی اپنے استاد شاہ عبدالعزیز کی آخری وصیت کے مطابق تمام غیر فوجی کاموں میں محمد اسحاق صاحب ہی کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔

حج سے واپس آنے کے کچھ دن بعد ہی سید احمد صاحب قریب دو ہزار ساتھیوں کو لے کر سندھ کے راستے کابل پہنچے اور پھر خیبر کے راستے پشاور لوٹ آئے۔ یہ تمام قافلہ بڑی دھوم دھام سے انگریزوں کی جانکاری میں روانہ ہوا، لیکن انگریزوں نے اس میں کوئی روک تھام نہیں کی۔ وجہ صاف تھی۔ انگریز راجا رنجیت سنگھ کی طاقت سے بُری طرح ڈرتے تھے۔ ایک طرف وہ راجا رنجیت سنگھ کے

دوست بنے ہوئے تھے اور دوسری طرف ملک بھر میں یہ جھوٹا پرچار کر رہے تھے کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بڑے ظلم کر رہی ہے۔ انگریزوں کی یہ چال بہت کام کر گئی۔ کچھ دنوں کیلئے ہندستان کو انگریزوں کی غلامی سے چھڑانے کا ارادہ رکھنے والی انقلاب کی یہ لہر سکھوں کی طرف مڑ گئی، اور اس کے بہادر نیتا اپنے دیش بھائیوں کے مقابلے میں ہی اڑ گئے۔

سید احمد صاحب سرحد کے پہاڑوں میں سکھ حکومت کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے اور سکھ حکومت بھی بڑی بہادری سے اُن کا مقابلہ کرتی رہی۔ انگریز ایک طرف تو راجا رنجیت سنگھ کو سید احمد صاحب کے خلاف مدد دیتے رہے اور دوسری طرف جب دہلی کے ایک ہندو رئیس نے سید احمد صاحب کی جماعت کا وہ روپیہ جو اُن کے یہاں جمع تھا، دینے سے انکار کر دیا تو انگریزوں نے اُس پر زور ڈال کر وہ روپیہ سید احمد صاحب کے پاس سرحد بھجوایا۔ اس طرح انگریز برابر دونوں طرف ملے رہے اور دونوں کی مدد کرتے رہے۔

۶ مئی سنہ ۱۸۳۱ء کو بالا کوٹ کے میدان میں سید احمد صاحب کو لڑتے لڑتے سکھ فوج نے مار ڈالا۔ سکھ فوج کے افسروں نے بڑی عزت کے ساتھ اُن کو دفن کیا۔ دوسری طرف اُن کے لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سید احمد صاحب کہیں غائب ہو گئے ہیں اور پھر واپس آویں گے۔ ہندستانی اور سرحدی علاقے میں آج بھی ایک ایسی جماعت ہے جو اس پر یقین کرتی ہے کہ سید احمد صاحب ابھی زندہ ہیں اور مہدی کا اوتار ہیں۔

پر سچ یہ ہے کہ وہ زور دار لہر جو انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لیے اٹھی تھی انگریزوں کی ہوشیاری سے اپنے ملک والوں ہی سے ٹکرا کر ختم ہو گئی۔

سید احمد صاحب کے مرنے کے بعد اس انقلابی پارٹی میں ایک دوسرے کے خلاف دو دل ہو گئے۔ ایک طرف شاہ محمد اسحاق اور ان کے خیال کے لوگ یہ کہتے تھے کہ ملک کے اصلی دشمن انگریز ہیں اور ملک یا مذہب کی کوئی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ انگریز کے پیر ہندستان میں جمے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیں سکھوں سے لڑنے کے بجائے اپنے ملک والوں سے مل کر انگریزوں کو باہر نکالنا چاہیئے دوسری طرف صادق پور کے مولانا ولایت علی اور اُن کے کچھ ساتھیوں کی رائے تھی کہ سکھوں کے خلاف لڑائی جاری رکھنی چاہیئے۔ شاہ محمد اسحاق کی پارٹی کا زور رہا اس لئے مولانا ولایت علی دہلی کی مرکزی کمیٹی سے الگ ہو گئے۔ اُن کی اولاد آج بھی سرحد کے پہاڑوں میں موجود ہے۔

اب اس تحریک کا سیدھا مورچہ انگریزوں سے تھا۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا یہ نیا دور تھا جو خالص نیشنل یا ملکی تھا۔ پورے گیارہ سال غور کرنے کے بعد شاہ محمد اسحاق صاحب نے ایک نیا پروگرام بنایا۔ انگریزوں سے لڑنے کے لئے مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی کا ایک بورڈ بنا کر وہ خود مکہ گئے۔ وہاں انہوں نے ترکی سلطنت سے اپنے سمبندھ قائم کئے اور ترکی کی مدد سے انگریزوں کو ہندستان

سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ دہلی کے بورڈ کو وہ برابر ہدایتیں بھیجتے رہتے تھے۔ کچھ دنوں میں انگریزوں کو شاہ محمد اسحاق صاحب کی کوششوں کا پتہ لگا۔ فوراً برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ترکی کی حکومت پر یہ زور ڈالا گیا کہ وہ شاہ محمد اسحاق صاحب کو جو اس وقت ترکی میں تھے اپنی حکومت سے باہر نکال دے۔ شاہ صاحب بڑی مصیبت میں پڑ گئے، وہاں کے ایک شیخ اکرم نام کے ایک شخص کی مدد سے انھوں نے یہ اجازت حاصل کرلی کہ وہ حجاز میں رہ سکتے ہیں۔

دہلی کا بورڈ انگریزوں کی نظروں سے بچا رہا کیونکہ اس کے صدر مولانا مملوک علی تھے جو دہلی کالج میں پروفیسر تھے۔ کہا جاتا ہے مولانا مملوک علی کو بورڈ کا صدر اسی لئے بنایا گیا تھا، جس سے یہ تمام تحریک انگریز ریزیڈنٹ کی خونی آنکھوں سے بچی رہے۔ کچھ دن بعد جب تحریک کے انقلابی پن میں کچھ ہلکا پن آنے لگا تو شاہ محمد اسحاق صاحب نے اس کی جگہ حاجی امداد اللہ صاحب کو مقرر کردیا۔ یہ وہی حاجی امداد اللہ صاحب ہیں، جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں شاملی کے مورچے پر انگریزوں کے دانت کھٹے کردئے تھے اور ۱۸۵۷ کی کرانتی ناکام ہونے پر اپنے دو ساتھیوں کو لے کر حجاز جا پہنچے تھے۔ انگریز سرکار لاکھ کوشش کرنے پر بھی انھیں گرفتار نہ کرسکی تھی۔

۱۸۴۶ء میں جب پورے ہندستان میں گیارہ برس بعد آنے والے انقلاب کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑنے لگی تھی۔ ہندستان سے باہر شاہ محمد اسحاق صاحب کا تیر یہ چھوٹ گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی پاک تحریک کو فرقہ وارانہ جھاڑ جھنکاڑوں سے نکال کر پھر سے صحیح راستے

پڑ لانا انھیں کا کام تھا۔ اس طرح اُنھوں نے نہ صرف اُس جماعت کی جس کے وہ امام تھے، بلکہ سارے ملک کی بھاری خدمت کی۔ اس کے لئے اُنھوں نے اپنے ساتھیوں کا دکھ دھندا سہا اور دیش بدیشوں کی خاک چھانی وہ اس جماعت کے تیسرے امام تھے، پھر بھی اس نئے دور کے وہ پہلے امام مانے جا سکتے ہیں۔ اس طرح اُن کی شخصیت اتہاس کی نظر سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی جماعت کا جو آج کل کا رُخ ہے اس کا بہت بڑا سہرا شاہ محمد اسحاق صاحب کے سر ہے۔ وہ آزادی کے سپنوں کو لئے ہوئے اس دنیا سے چلے گئے کاش! وہ گیارہ سال اور جیتے رہتے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ایک جھلک انھیں دیکھنے کو مل جاتی، جس میں اُن کے ساتھیوں اور شاگردوں نے بڑی ہمت اور دلیری سے حصہ لیا تھا۔

حاجی امداد اللہ صاحب

۱۸۴۶ء میں ولی اللہی جماعت کے تیسرے امام شاہ محمد اسحاق صاحب کا مکے میں انتقال ہوگیا۔ اُن کی جگہ حاجی امداداللہ صاحب اِس جماعت کے چوتھے امام چُنے گئے۔ ۱۸۴۱ء میں محمد اسحاق صاحب کے مکہ چلے جانے کے کچھ برس بعد سے ہی اُن کی ہدایتوں کے مطابق حاجی امداد اللہ صاحب ہندستان میں اس سنگٹھن کو چلا رہے تھے۔ اُن کے کام کرنے کے ڈھنگ نے شاہ محمد اسحاق صاحب کے اور جماعت کے دوسرے کام کرنے والوں اور نیتاؤں کے دلوں میں اُن کے لئے گھر کرلیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آخری وقت میں شاہ محمد اسحاق صاحب نے ولی اللہی جماعت کی امامت کے لئے حاجی امداد اللہ صاحب کے نام کی وصیت کی تو سب کو ایسا معلوم ہوا جیسے شاہ صاحب نے اُن کے ہی دل کی بات کہہ دی ہو۔

حاجی امداد اللہ صاحب کی پیدائش ۱۲۳۳ھ ہجری میں قصبہ نانوتہ (سہارن پور) میں ہوئی تھی۔ آپ کا بچپن کا نام امداد حسین تھا۔ پڑھنے لکھنے میں آپ بچپن سے ہی بہت تیز تھے۔ یہ آپ کی و ملک کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کو شیخ محمد قلندر، شیخ الٰہی بخش صاحب کاندھلوی

اور شیخ نصیرالدین صاحب دہلوی جیسے گرو مل سکے، جنھوں نے اپنے اس شاگرد کے دل کو خدا پرستی اور دیش بھگتی کی روشنی سے جگمگا دیا۔

حاجی امداد اللہ صاحب اپنے ان اُستادوں کے ذریعے شاہ ولی اللہ صاحب کے اُصولوں اور اُن کی جماعت کے کاموں سے واقف ہوئے اور پھر خود اُس میں شریک ہو گئے۔ شروع میں اُن کا تعلق سید احمد صاحب بریلوی اور اُن کی اُس جماعت سے رہا جو سرحد پر انگریزوں سے جنگ کر رہی تھی۔ لیکن ۱۸۳۱ء میں جب سید احمد صاحب بالاکوٹ کے میدان میں مارے گئے تب آپ نے دلّی کے مدرسے سے اپنا ناتا پھر سے جوڑنے کی ضرورت دیکھی۔ یہ ایک بڑی بات تھی۔ کیونکہ اُس وقت تک سید احمد صاحب کی جماعت کے لوگ اس خیال کے ہو چکے تھے کہ دلّی کے مدرسے سے کوئی واسطہ نہ رکھ کر اپنا الگ سنگٹھن بنایا جائے اور سکھوں کے خلاف جہاد جاری رکھا جائے۔ پر حاجی امداد اللہ صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک کے اصلی دشمن سکھ نہیں انگریز ہیں۔ اُس وقت سکھوں اور انگریزوں میں گہری دوستی تھی لیکن یہ صرف انگریزوں کی ایک چال تھی جس سے سکھ اور مسلمان آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کی طاقت کمزور کرتے رہیں اور انگریزوں کی طاقت بڑھتی رہے۔

اس خیال کو لے کر جب حاجی امداد اللہ صاحب دلّی پہونچے تو معلوم ہوا کہ دلّی کے مدرسے کے امام شاہ محمد اسحاق صاحب مکہ جا چکے

ہیں اور وہیں ہندستان میں اپنے سنگٹھن کو مضبوط کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ آپ شاہ محمد اسحاق صاحب سے ملنے کے لئے فوراً مکہ گئے۔ وہاں قریب ایک سال تک رہ کر شاہ محمد اسحاق صاحب سے صلاح مشورہ کرتے رہے کہ ہندستان میں لوگوں کو کیسے جگایا جاوے اور کیسے انقلاب پیدا کیا جاوے۔ شاہ محمد اسحاق صاحب پر اُن کی اس ایک سال کی سنگت کا یہ اثر پڑا کہ انھوں نے حاجی امداد اللہ صاحب کو اپنا نائب امام یا دمشیر، بنا دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب ۱۲۶۲ھ ہجری میں ہندستان لوٹے اور یہاں اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۸۴۶ء میں شاہ محمد اسحاق صاحب کے انتقال ہوجانے پر اس جماعت کا پورا بوجھ حاجی امداد اللہ صاحب پر آپڑا۔

۱۸۴۶ء کا زمانہ ہندستان کے لئے بڑی اُتھل پتھل کا تھا۔ یوں تو ہندستان کی سرزمین پر جب سے انگریزوں نے پیر رکھا تبھی سے یہاں کے لوگوں کے لئے سکھ کی نیند سونا حرام ہوگیا، لیکن ادھر جیوں جیوں دلّی کے مغل بادشاہ کی حالت اور طاقت کمزور ہوتی گئی تیوں تیوں انگریزوں کے ظلم اور جبر بھی بڑھتے چلے گئے۔ اس ظلم اور جبر کے خاص شکار اس وقت مسلمان تھے۔ کیونکہ ولی اللٰہی جماعت کی تحریک نے مسلمانوں میں جو بیداری پیدا کردی تھی اُسے کمپنی کے نمائندے اور حاکم پھوٹی آنکھوں بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ لارڈ الیبر دنے جو ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۴ء تک ہندستان کے گورنر جنرل رہے، اپنے ۱۸ر جنوری ۱۸۴۳ء کے ایک

خط میں ڈیوک آف ولینگٹن کو لکھا تھا۔ "میں اس حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ مسلمان قوم جڑسے ہی ہماری دشمن ہے، اس لئے ہماری سچی پالیسی ہندوؤں کو اپنی طرف ملائے رکھنے کی ہونی چاہیئے"۔ اپنی گورنر جنرلی کے وقت میں وہ اپنی اسی چال کے مطابق کام کرتے رہے!

مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں نفرت اور غصہ پیدا کرنے کے لئے لارڈ ایلنبرو نے لکڑی کے دو دروازے تیار کرائے۔ پھر ان دروازوں کی بابت یہ مشہور کیا گیا کہ یہ سومناتھ کے مندر کے وہ دروازے ہیں جن کو محمود غزنوی مندر کے پھاٹک سے اتروا لے گیا تھا۔ لارڈ ایلنبرو نے ۱۶ر جنوری ۱۸۴۲ء کو ہندستان کے تمام ہندو سرداروں اور راجا مہاراجوں کے نام ایک اعلان شائع کیا۔ اس اعلان میں انگریزوں اور انگریزی سرکار کو ہندوؤں کا خاص حامی بتایا اور کہا کہ ان دروازوں کو انگریز غزنی سے لے آئے ہیں اور سومناتھ کے مندر میں ہم ان کو پھر سے لگوا دیں گے۔ اس کے بعد ان دروازوں کے جگہ جگہ جلوس نکلوائے گئے۔ بعد میں پتہ چل گیا کہ دروازے جعلی تھے۔ وہ جعلی دروازے آج تک آگرے کے قلعے میں رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تو انگریزوں کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی ایک مثال ہے، جو تمام ہندستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمپنی کے علاقے میں عام جنتا کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ یہ تھا کہ اگر کوئی

ہندستانی گھوڑے پر سوار ہوکر انگریزوں کے سامنے سے نکلتا تھا، تو وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اونچی سے اونچی حیثیت کے ہندستانی کو ایک معمولی انگریز ٹامی کی عزّت کے لئے گھوڑے سے اُترنا پڑتا تھا۔ تمام ملک میں ہندو یا مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے بڑے جوش کے ساتھ کام ہورہا تھا۔ اس بارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی کمیٹی کے صدر مسٹر مینگلس نے ایک بار انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں کہا تھا۔ "پرماتما نے ہندستان کا لمبا چوڑا سماج انگلستان کو اس لئے سونپا ہے کہ ہندستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک عیسیٰ مسیح کا جھنڈا پھہرانے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی پوری طاقت اس کام میں لگا دینا چاہئے جس سے تمام ہندستان کو عیسائی بنانے کے کام میں دیش بھر میں کہیں سے ذرا بھی ڈھیل نہ آنے پاوے۔"

یہ، عیسائی بنانے کا کام، کہیں ہسپتال کھول کر تو کہیں ہندستانی فوجی افسروں کو عیسائی مت میں داخل ہونے پر ترقی دینے کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ اسکول قائم کئے جارہے تھے جن میں عیسائی پادری ہندستانی لڑکوں کے دلوں پر یہ چھاپ ڈالنے کے لئے دن رات محنت کرتے تھے کہ ہندستان ہمیشہ سے ایک پچھڑا ہوا ملک رہا ہے، دنیا میں سچا مذہب صرف عیسائیوں کا ہے اور اس میں داخل ہونے پر ہی ان کو دنیاوی اور روحانی ترقی حاصل ہوسکتی ہے۔

دلّی میں شاہی تخت پر اس وقت بہادر شاہ تھے، جن کے

ہر ایک کام میں انگریز رزیڈنٹ ڈھٹائی کے ساتھ دخل دیتا رہتا تھا۔ اگر بادشاہ ایک شاہ زادے کو اپنا وارث بنانا چاہتے تھے تو انگریز رزیڈنٹ دوسرے شاہ زادے کا نام لیتا تھا اور اسکو ابھار کر شاہ زادوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس وقت سے پہلے گورنر جنرل کی مہر میں "بادشاہ دلی کا فدوی خاص" لفظ کھدے رہتے تھے، لیکن اب وہ نکال دیئے گئے۔ سب ہندستانی سرداروں و رئیسوں کو یہ سخت ہدایت کردی گئی کہ وہ ان لفظوں کا استعمال نہ کریں۔ اس طرح بادشاہ کی حیثیت صرف وظیفہ پانے والے ایک چھوٹے سے رئیس کی سی ہوگئی تھی۔ یہی حالت ملک کے دوسرے راجا نوابوں کی تھی۔ اس طرح تمام ہندستان میں اس وقت اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

حاجی امداد اللہ صاحب ان مشکلوں سے نہیں گھبرائے۔ انھوں نے پہلے اپنی جماعت کا پھر سے سنگٹھن کیا۔ بدقسمتی سے اسوقت ولی اللہی جماعت میں بھی دو گروہ ہو چلے تھے۔ ایک گروہ کے نیتا مولانا ولایت علی صادق پوری تھے۔ انھیں یہ یقین تھا کہ سید احمد صاحب بریلوی بالاکوٹ کے میدان میں نہیں مارے گئے، بلکہ کسی وجہ سے چھپ گئے ہیں اور وہ جب بھی ٹھیک سمجھیں گے تب ظاہر ہو کر ملک کے دشمنوں کے ساتھ پھر سے لڑائی شروع کریں گے۔ اس گروہ کے لوگ اپنے اسی یقین پر برابر آدمیوں کی بھرتی کرتے رہتے تھے اور روپیہ بھی اکٹھا کرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ انگریزوں کے ساتھ لڑائی چھیڑ دینے کو تیار نہیں تھے اور سید احمد صاحب کے انتظار میں بیٹھے رہنا چاہتے

تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے اُن کو ساتھ لینے کی کوشش کی، لیکن ناکامیاب رہے۔ آخر کار ان لوگوں سے الگ رہ کر ہی اُن کو کام کرنا پڑا۔

اُس وقت حاجی امداد اللہ صاحب کے خاص ساتھیوں میں مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی تھے۔ ان ساتھیوں کو لے کر انھوں نے جگہ جگہ گھومنا شروع کیا اور عام جنتا کو بتلایا کہ انگریزوں کی عملداری کے خلاف تلوار اٹھانے کا اس سے بہتر موقع دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اس کے لیے انھوں نے اپنے دلّی کے مدرسے کے تمام پُرانے طالب علموں کے ساتھ نئے سرے سے تعلق پیدا کیے اور کچھ ہی دنوں میں اپنے سنگٹھن کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

لارڈ ڈلہوزی کی ریاستوں کو ضبط کرنے اور ہندستان کے راجا رئیسوں کو بے عزّت کرنے کی پالیسی نے بھی حاجی امداد اللہ صاحب کے کام میں کافی مدد دی۔ راجاؤں اور رئیسوں کا یہ طبقہ، جو تب تک چھوٹی موٹی چالوں اور لالچوں میں پھنس کر انگریزوں کے ساتھ اپنے ہی بھائیوں اور برابر والوں کے خلاف لڑنے لگتا تھا، اب مل جل کر انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن حاجی امداد اللہ صاحب کو اُن پر پورا بھروسہ نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اصلی طاقت جنتا کی طاقت ہی اور کوئی بھی آزادی کی لڑائی جب تک نہیں چل سکتی، جب تک کہ عام جنتا اس میں حصّہ نہ لے۔

اس لئے راجا نوابوں سے تعلق پیدا کرنے کے پھیر میں نہ پڑ کر وہ اپنی تقریروں اور تحریروں سے عام جنتا اور خاص طور پر مسلمانوں کے بیچ پرچار کرتے رہے۔ حاجی امداد اللہ صاحب ایک انقلابی نیتا ہونے کے ساتھ ساتھ اونچے درجے کے صوفی اور فقیر بھی تھے۔ ان کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ وہ جس سے ملتے اس پر گہرا اثر ڈالتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں آزادی کی لڑائی شروع ہوتے ہی ہزاروں مسلمان ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ ان کے تمام شاگردوں نے اور دلی کے مدرسے کے سب پرانے طالب علموں نے اپنی اپنی جگہ سے اس آزادی کی لڑائی کے لئے کافی رنگروٹ دئے اور جب تک لڑائی چلتی رہی تب تک اس میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ حاجی امداد اللہ صاحب خود بھی اس موقع پر صرف وعظ (اپدیش) اور تقریروں تک ہی نہیں رہے، بلکہ شاملی کے مورچے پر ایک سپہ سالار کی حیثیت سے حصہ لے کر انہوں نے یہ دکھا دیا کہ وہ جتنے جوش کے ساتھ تقریر اور تحریر کے میدان میں اترتے تھے اتنی ہی قابلیت کے ساتھ لڑائی کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھا سکتے تھے۔ شاملی کی ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں انکے چاروں ساتھی مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اپنے اس امام کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لڑ رہے تھے۔

حاجی امداد اللہ صاحب نے اس موقع پر ایک بار پھر یہ کوشش کی کہ مولانا ولایت علی اور ان کے ساتھی

بھی اِس آزادی کی جنگ میں شریک ہو جائیں اور اُن کے ذریعے سرحد کے پٹھانوں کی مدد بھی مل جائے۔ اس کے لئے اُنھوں نے اپنے کچھ شاگردوں کو سرحد کی طرف بھیجا لیکن پنجاب کے چیف کمشنر سر جان. لارنس نے سرحد کے کچھ مُلاؤں کو پہلے سے ہی رشوتیں دیکر اپنی طرف ملا لیا تھا۔ یہ مُلّا برابر اس بات کا پرچار کرتے رہے کہ یہ لڑائی کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اصل لڑائی تو تب شروع ہوگی جب سید احمد صاحب بریلوی پھر سے ظاہر ہونگے' اس پرچار نے حاجی امداد اللہ صاحب کی کوشش کو ناکام کردیا۔ البتہ پشاور اور ہوتی مردان کی چھاؤنیوں میں رہنے والی کچھ پٹھان پلٹنوں نے اس لڑائی میں شریک ہونے کی ضرور کوشش کی پر وقت سے پہلے ہی انگریزوں کو اُن کے ارادوں کا پتا چل گیا۔ اُن سے ہتیار رکھوا لئے گئے اُن میں سے ایک بڑی تعداد کو توپوں کے مُنہ سے اُڑوا دیا گیا۔

دھیرے دھیرے سن ستاون کی یہ آگ ٹھنڈی پڑنے لگی۔ انگریزوں نے تمام ہندستان میں اس کا سخت بدلا لینا شروع کیا۔ اس بدلے کے شکار خاص طور پر مسلمان ہوئے کیونکہ انھوں نے ۱۸۵۷ کی جنگ میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ انگریز اس بات سے لنتے چڑھ گئے تھے کہ ہزاروں ہی آدمیوں کو صرف مسلمان ہونے کے قصور میں پھانسی پہ چڑھا دیا گیا' یا اس لئے مار ڈالا گیا کہ ڈاڑھی رکھنے کی وجہ سے وہ مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں بھی ولی اللٰہی جماعت کے کام کرنے والوں کو کھوج کھوج کر ٹانے

اور برباد کرنے کی کوشش کی گئی۔ حاجی امداد اللہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو خاص طور پر گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی لیکن رشید احمد صاحب گنگوہی کے سوا اور کوئی گرفتار نہیں کیا جا سکا۔

حاجی امداد اللہ صاحب نے ان تمام باتوں پر ایک بار پھر غور کیا اتنی بڑی اور ملک بھر میں پھیلی ہوئی کوشش کی ناکامی نے اُن کے دل کو بڑا صدمہ پہونچایا۔ اُن کے ہزاروں شاگرد اور ساتھی پھانسی پر چڑھا دئے گئے تھے یا فرار رہ کر انگریزوں کے پنجوں سے اپنی حفاظت کرتے پھرتے تھے۔ پھر بھی ایک سچے کرانت کاری کی طرح ایسی حالت میں بھی اُنھوں نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اُنھوں نے ہندستان کا کام مولانا محمد قاسم صاحب پر چھوڑا اور خود مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا عبدالغنی صاحب کے ساتھ چھپتے چھپتے مکہ جا پہونچے۔

مکہ میں پہونچنے کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب نے ہندستان میں لپٹے گئے ہوئے سنگٹھن کو پھر سے جمانے کی کوشش کی۔ اس کے لئے وہ برابر ہندستان میں مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس ہدایتیں بھیجتے رہے۔ اس وقت سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے نام بھی وارنٹ تھا۔ اس لئے کچھ دنوں تک اس کام میں کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی دی۔ برسوں بعد عام معافی کے اعلان ہونے پر حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی چھوٹ کر آ گئے۔ اب مولانا

قاسم صاحب کو ایک ساتھی مل گیا۔ اُس وقت ہندستان کی حالت یہ تھی کہ لوگ انگریز کے خلاف سوچنے میں بھی ڈرتے تھے۔ جگہ جگہ جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ مسلمان مولویوں پر خاص طور پر نظر رکھی جاتی تھی۔ سنہ ستاون کے بعد انگریزوں کے ظلم کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ تھی۔ اُس نے دلوں میں ڈر بٹھا دیا تھا۔

سب حالت پر غور کرنے کے لئے ولی اللٰہی جماعت کے تمام خاص خاص نیتا حجاز میں جمع ہوئے اور بہت غور کرنے کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب کی رائے سے یہ طے پایا کہ جس طرح سب سے پہلے امام شاہ ولی اللہ صاحب نے مدرسے کے ذریعے اپنے اصولوں اور خیالوں کا پرچار کیا تھا، اُسی طرح مسلمانوں میں پھیلی ہوئی موجودہ کم ہمتی اور اُن میں انگریزی سلطنت و انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثر کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر سے ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ مدرسہ کسی ایسی معمولی جگہ قائم ہو جہاں وہ انگریزوں کی نظر سے بچا رہ سکے۔

اس فیصلے کو عمل میں لانے کی ذمہ داری مولانا محمد قاسم صاحب پر دی گئی اور رشید احمد صاحب گنگوہی اُن کے نائب بنائے گئے۔

اس کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب ۱۳۱۷ھ ہجری یعنی تقریباً ۱۸۹۷ تک زندہ رہے اور اپنے گرو شاہ محمد اسحاق صاحب کی طرح مکہ ہی سے اس انقلابی جماعت کو مدد پہنچاتے

رہے۔ جو مسلمان حج کے لیے مکہ پہنچتے تھے اُن کے ذریعے حاجی امداد اللہ صاحب اپنا تعلق ہندستان سے بنائے رکھتے تھے اور یہاں کے لیے ہدایتیں وغیرہ بھیجتے رہتے تھے۔ اُن کے آخری شاگردوں میں اب سب سے زیادہ مشہور مولانا حسین احمد صاحب مدنی ہیں جو ولی اللٰہی جماعت کے موجودہ امام اور آزادی کی لڑائی کے ایک جانے مانے ہوئے بہادر سپہ سالار ہیں۔

اس طرح ۱۳۱۷ھ ہجری کی کسی تاریخ کو ۸۴ سال کی عمر میں ہندستان کا یہ بہت بڑا صوفی، بہت بڑا فقیر، بہت بڑا کرانتکاری بہت بڑا عالم اور ولی اللٰہی جماعت کا چوتھا امام موت کی گود میں جا سویا۔ مرتے مرتے بھی اُن کے دل میں اپنے وطن کی ایک جھلک دیکھنے کی حسرت تھی، پر ساتھ ہی یہ تسلی بھی تھی کہ کم سے کم برٹش جھنڈا اُن کے سر پر نہیں اُڑ رہا ہے۔

مولانا محمد قاسم

۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی ناکامیاب ہو جانے کے بعد ولی اللہی سنگٹھن کے چوتھے نیتا حاجی امداد اللہ صاحب مکّہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مکّہ جانے سے پہلے انھوں نے ہندستانی مسلمانوں میں ملک کی آزادی کے لئے لڑنے اور سنگھٹت ہونے کے اصولوں کا پرچار کرنے کا کام مولانا محمد قاسم صاحب کو سونپا۔ اُس وقت مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے ایسی دقتیں تھیں جن کا پورا پورا خیال بھی اس وقت نہیں کیا جا سکتا۔

اُن کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی دقّت تو یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حصّہ لینے کے جرم میں سرکاری جاسوس ہاتھوں میں پھانسی کا پھندا لئے جگہ جگہ اُن کی موجودگی سونگھتے پھرتے تھے۔ مولانا کو پھانسی کا ڈر تو نہ تھا کیونکہ اگر ڈر ہوتا تو وہ حاجی امداد اللہ صاحب کے ساتھ ہی مکّہ جا سکتے تھے، لیکن وہ زندہ رہنا چاہتے تھے، جس سے اس تحریک کو، جو پچھلے قریب ڈیڑھ سو برس سے چلتی آ رہی تھی اور جس کو شاہ ولی اللہ صاحب سے لے کر حاجی امداد اللہ صاحب کے زمانے تک بڑے بڑے دیش بھکتوں نے اپنے خون سے سینچا تھا، کسی طرح آگے بھی زندہ رکھ سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حاجی امداد اللہ صاحب کا مکّہ چلا جانا ہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ زیادہ مشہور ہونے کی وجہ سے ان کے جلد پکڑ جانے کا خطرہ ہی

اور باقی کے ساتھیوں میں میں ہی ایسا ہوں جو اس تحریک کو، جو اس وقت قریب قریب بالکل ہی ختم ہو چکی ہے، پھر سے زندہ کرنے کے لئے کچھ کام کر سکتا ہوں۔ یہ ولی اللہی سنگٹھن اور اس کے نیتاؤں کی ایمان داری کا ایک بڑا ثبوت ہے کہ ایسے وقت میں بھی ان کے نظام میں کسی طرح کی پھوٹ نہیں پڑی۔ تحریک کے امام نے جس سے یہ کہا کہ وہ ان کے ساتھ مکہ چلے وہ چلا گیا اور جس سے یہ کہا کہ وہ ہندستان ہی میں رہے وہ ہندستان میں ہی رہا۔

مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے ایک دوسری دقت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامیابی اور اس کے بعد کے انگریزوں کے ظلموں نے مسلمانوں میں بڑی پست ہمتی پیدا کر دی تھی۔ ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ انگریزوں کی طاقت اتنی بڑی ہے کہ ان سے لڑنے کا خیال کرنا اپنی و قوم کی بربادی کو نیوتا دینا ہے۔ اس سے یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ جب انگریزوں سے اس وقت لڑنا نہیں ہے اور ان کی حکومت میں ہی رہنا ہے تو کیوں نہ ان سے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کی جائیں اور ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ مسلمان قوم اب انگریزوں کی اتنی ہی وفادار ہے جتنی ہندستان کی دوسری قومیں۔ اس لئے مسلمان نوجوانوں کو بھی تعلیم اور نوکریوں میں دوسری قوموں کی طرح حصہ ملنا چاہیئے۔

ایسا خیال رکھنے والوں میں کچھ ایسی بڑی بڑی ہستیاں بھی تھیں جو اپنے اونچے چال چلن اور قابلیت کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت اثر رکھتی تھیں

اس خیال کے لوگوں میں سب سے بڑی ہستی سرسید احمد خاں صاحب کی تھی جو مولانا مملوک علی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے مولانا محمد قاسم صاحب کے گرو بھائی ہوتے تھے۔ سرسید احمد صاحب ۱۸۵۷ء سے انقلاب سے پہلے ہی انگریزوں کی نوکری میں آ چکے تھے اور انگریزوں کی رہن سہن و اُن کے کام کرنے کے ڈھنگ کا اُن پر گہرا اثر پڑا تھا۔ ۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے دلی میں جو قتل عام کیا تھا، اس میں سرسید احمد صاحب کے ایک سگے چچا مارے گئے تھے۔ اور ان کی بوڑھی ماں کو ایک نوکر کے گھر میں چھپ کر جان بچانی پڑی تھی۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں سید احمد صاحب نے غدر کے وقت اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی کئی انگریزوں کی جان بچائی تھی۔ اس لئے جب انگریزی فوجوں کے ذریعہ اپنے خاندان کی اس بربادی کا حال انھوں نے سُنا تو اس کا اثر اُن پر پڑنا لازمی تھا۔ اُس زمانے میں اُنکی لکھی مشہور کتاب "اسباب بغاوت" میں ہم اس اثر کو آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ان کے خیالوں میں پھیر پلٹے۔ اس وقت سرکاری نوکریوں سے مسلمانوں کو الگ رکھنے کی انگریزوں کی پالیسی نے اُن کے دل پر گہرا اثر ڈالا اور انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کو گہرا دھکا لگے گا، اور وہ تعلیم و دوسری چیزوں میں ہندوستان کی دوسری قوموں سے بُری طرح پچھڑ جائیں گے۔ اس سے بچنے کا انہیں صرف ایک ہی راستہ سوجھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں اور انگریزی تہذیب کے لیے جو نفرت

ہی وہ نکال دی جائے اور انگریزوں کے دل سے بھی مسلمانوں کے باغی ہونے کا خیال مٹا دیا جائے۔

سرسید احمد صاحب اپنے عقیدے کے سچے مخلص اور قوم کی سچی بھلائی چاہنے والے تھے۔ ان کے دل میں اپنی قوم کے لئے اتنا ہی درد اور اس کی ترقی کے لئے قربانی کرنے کا ویسا ہی جذبہ تھا جیسا مولانا محمد قاسم صاحب کے دل میں تھا۔ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ پھر بھی دونوں کا راستہ نہ صرف ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے کے خلاف تھا۔ ایک کو انگریزوں کی ہر ایک چیز میں نئی روشنی اور خوبی ہی خوبی نظر آتی تھی تو دوسرے کو انگریزوں کی چھایا سے بھی نفرت تھی۔ ایک انگریزوں کی وفاداری میں ہی قوم اور ملک کی ترقی دیکھتا تھا تو دوسرے کے لئے انگریزوں کی مخالفت نہ کرنا اپنے ایمان کو دھوکا دینا تھا۔ یہ اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی مقصد ہوتے ہوئے بھی دو نہایت سچے اور نہایت قابل انسانوں میں بھی کتنا گہرا فرق اور ورودھ ہو سکتا ہے۔

اس طرح مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے دوسری بڑی مشکل یہ تھی کہ ۵۷ء کے انقلاب کی ناکامیابی کی وجہ سے پست ہمت مسلمانوں میں انگریزوں کے لئے وفاداری رکھنے اور ان کی تہذیب کو اپنانے کا پرچار جاری ہو چکا تھا۔ اس پرچار میں انگریز ہر طرح سے بھاری مدد دے رہے تھے۔ دوسری طرف ایک کے بعد دوسری سازشوں کے مقدمے چلا کر انگریز سرکار مسلمان مولویوں اور

عالموں کو لمبی لمبی سزائیں دے کر کالے پانی بھیج رہی تھی. ایسی حالت میں مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے یہ سوال پیش تھا کہ ان چیزوں کا مقابلہ کس طرح کیا جاوے اور مسلمانوں کو ولی اللہی جماعت کے جھنڈے کے نیچے لاکر ان میں آزادی کے خیالات کیسے پیدا کئے جائیں۔

کچھ دنوں کے بعد جب حجاز سے حاجی امداداللہ صاحب نے کسی معمولی سی جگہ پر ایک مذہبی مدرسہ قائم کرنے کی اسکیم مولانا قاسم صاحب کو بھیجی تو اُن کو اس اندھیرے میں تھوڑی روشنی نظر آئی اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے صرف دس برس بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں عربی تاریخ ۱۵۔ محرم ۱۲۸۳ ہجری کو سہارنپور سے بائیس میل دور دیوبند جیسے ایک نہایت معمولی قصبہ میں انھوں نے دارالعلوم (علم کا گھر) کے نام سے ایک مذہبی مدرسہ قائم کر دیا۔ اس مدرسہ کو قائم کرنے میں مولانا قاسم صاحب کے علاوہ ان کے پُرانے ساتھی حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی کا جو غدر میں حصّہ لینے کے جرم میں پھانسی پاتے پاتے بچے تھے، خاص ہاتھ تھا، ان کے علاوہ مولانا مہتاب علی صاحب اور ان کے بھائی مولانا ذوالفقار علی صاحب نے بھی اس کام میں پوری مدد کی تھی۔

مولانا قاسم صاحب نے جب یہ مدرسہ قائم کیا تب نہ انکے پاس پیسہ تھا اور نہ کوئی پیسے والا مددگار ہی تھا۔ عام لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ ان سے باتیں کرتے بھی ڈرتے تھے پھر مدد کون کرتا؟ مدرسہ کے سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن تھے جو آگے چلکر مولانا صاحب کے سچّے جانشین

اور ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام نے۔
شروع میں درختوں کے سایہ میں پڑھائی ہوئی۔ اس وقت کون یہ جانتا تھا کہ یہ جو دو چار لڑکے ایک بوڑھے سے مولوی کے آگے بیٹھے ہوئے کلام پاک ہل ہل کر پڑھ رہے ہیں اور یہ مدرسہ جس میں دھوپ اور بارش سے بچاؤ کے لئے ایک چھت تک نہیں ہے کچھ برسوں کے بعد ہی ملک کی آزادی کے سپاہیوں کی ایک خاص چھاؤنی ہوگی نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا بھر کے اسلامی مدرسوں میں ایک خاص مدرسہ بن جائے گا۔
اس کے کچھ دن بعد ہی سرسید احمد صاحب نے علی گڑھ میں مسلم نوجوانوں کو انگریزی تعلیم دینے کے لئے ایک کالج کھولنا طے کیا۔ اس میں پڑھانے کے لئے ولایت سے انگریز پروفیسر بلائے گئے۔ سرسید احمد صاحب کی خواہش تھی کہ کالج کی اس تحریک میں مولانا قاسم صاحب بھی شریک ہو جائیں مگر قاسم صاحب نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اس بارے میں سرسید احمد صاحب اور ان کے ساتھیوں و مولانا قاسم صاحب میں بڑی لمبی خط و کتابت چلی وہ "تصفیۃ العقائد" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں نکل چکی ہے۔ اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا قاسم صاحب اس زمانے میں بھی جب کسی مسلمان مولوی کیلئے انگریزوں کی عملداری کی نکتہ چینی کرنا بھی کالے پانی کی سزا کو نیوتا دینا تھا کتنی نڈرتا سے اپنے وچار اور عقیدے کو ظاہر کر سکتے تھے۔
اس زمانہ میں مولانا قاسم صاحب اور ان کے ساتھیوں

کے خلاف کافی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں۔ انگریزی سلطنت کی طرف سے ان لوگوں کو ایک عرصہ سے "وہابی" تو مشہور کر ہی دیا گیا تھا، ساتھ ہی ساتھ ان کو رجعت پرست (پرتی کریا وادی)، لکیر کے فقیر اور ملک و قوم کا دشمن اور انگریزوں کی سلطنت کا باغی بھی قرار دیا گیا۔ سچ بات یہ تھی کہ آخری الزام کے سوا باقی سب بالکل بے بنیاد تھے۔ اور آخری الزام پر تو ان کو خود بھی اعتراض نہیں تھا۔

مولانا قاسم صاحب اس پرچار سے ذرا بھی نہیں گھبرائے وہ جانتے تھے کہ جب کوئی قوم اس طرح کچل دی جاتی ہے تب اس کے خیالوں میں بڑی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بہت بار وہ اپنی بھلائی چاہنے والوں ہی کی دشمن ہو جاتی ہے۔ انھوں نے ان باتوں کی پرواہ نہ کرکے چپ چاپ اپنا کام جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوبند کا یہ مدرسہ جو صرف تین چار طالب علموں سے شروع ہوا تھا دنوں دن ترقی کرتا گیا اور تمام ہندستان اور ہندستان کے باہر کے اسلامی ملکوں سے بھاری تعداد میں طالب علم وہاں آنے لگے۔ جب اس طرح مدرسہ کی ترقی ہونے لگی اور اس کا اثر مسلمانوں پر بڑھتا گیا تو کچھ ایسے لوگ بھی جن کو ابھی تک مدرسہ کے پاس آنے میں بھی دہشت ہوتی تھی مدرسہ کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ ان کی طرف سے یہ سوجھاؤ بھی پیش کیا جانے لگا کہ اب مدرسہ کے لئے سرکاری مدد بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح مدرسہ کی مالی حالت مضبوط بنا دی جائے۔

مولانا قاسم صاحب نے ایسے لوگوں کی ہمدردی اور اُن کے

سوچاؤں کے خطروں کو جھٹ پہچان لیا۔ چونکہ مدرسہ کسی کے ذاتی اختیار میں نہیں تھا، اس لئے وہ مدرسہ کے کام میں کسی کو حصہ لینے سے روک تو نہیں سکتے تھے۔ لیکن وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اس طرح یہ مدرسہ صرف لڑکوں کی کتابی تعلیم دینے والا ایک مدرسہ بن کر رہ جائے اور اپنے سچے اصولوں کو بھول جائے، اس خطرے سے مدرسہ کو بچانے کے لیے انھوں نے کچھ قاعدے بنائے۔ جو ان کے کرانت کاری وچاروں کو بالکل صاف ظاہر کرتے ہیں۔ یہ قاعدے 'رسالہ القاسم' ۱۳۴۷ ہجری کے دارالعلوم نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ اور اسی سے ان کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ آزادی ضمیر (وچاروں کی آزادی) کے ساتھ موقع پر کلمۃ الحق (سچائی) کا اعلان ہو۔ کوئی سنہری تھیلوں (لالچ) اور مربیانہ دباؤ (بڑپن کا دباؤ) یا سرپرستانہ مراعات (رکشا کرنیوالوں کی طرف سے دی ہوئی رعائتیں) اس میں حائل نہ ہوں (رکاوٹ نہ ڈالیں)۔

۲۔ اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم (سنگھٹن) پیدا کر دے۔ جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی شان کے برقرار رکھنے میں معین (سہائک) ہو۔

ان دونوں قاعدوں سے یہ صاف مطلب نکلتا ہے کہ مولانا قاسم صاحب کے نزدیک اس مدرسہ کی سب سے بڑی اہمیت صرف یہ تھی کہ اس کے ذریعہ تمام مسلمانوں میں اسی طرح سے

ایک سنگٹھن پیدا ہو سکے جس طرح شاہ ولی اللہ نے اپنے دلّی کے مدرسے کے ذریعے پیدا کیا تھا. وہ نہیں چاہتے تھے کہ کچھ بڑے بڑے رئیس اور نواب اپنے پیسہ کے بل پر اس مدرسہ پر چھا جائیں اور اس کے اصلی اصولوں کو کچل دیں. ان کے اس خیال کا دوسرا ثبوت اس وصیت سے ملتا ہے جو انھوں نے مرتے وقت کی تھی اپنی اس وصیت میں انھوں نے مدرسہ کے بابت لکھا تھا۔

۱۔ "اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی سبیل (ذریعہ) یقینی نہیں ہے تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ (اگر خدا نے چاہا) اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی یقینی ایسی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے (پرماتما کے نام پر نچھاور ہے) وہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں (کام کرنے والوں) میں نزاع (جھگڑا) پیدا ہو جائے گا۔ القصہ (سارانش یہ ہے کہ) آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع (طرح) کی بے سروسامانی ملحوظ رہے (غریبی کا دھیان رکھا جائے)۔

۲۔ سرکار کی شرکت (شامل ہونا) و اُمراء (امیروں) کی شرکت بھی زیادہ مُضر (نقصان پہنچانے والی) معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ تا مقدور (جہاں تک ہو سکے) ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب . . (برکت دینے والا) معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے اُمید ناموری (نام کی اچھا) نہ ہو بالجملہ (آخر کار) حسن نیت اہلِ چندہ (چندہ دینے والوں کی اچھی نیت) زیادہ پائداری (مضبوطی) کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

یہ وصیت ایک ایسا کرانت کاری دستاویز ہے جس سے ہندستان کی اگلی پیڑھیاں ہمیشہ ایک روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔ اس کے ایک ایک لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا قاسم صاحب کتنے بڑے انقلابی اور ملک کی آزادی کے کتنے سچے دیوانے تھے۔ انہیں صرف چاہ تھی تو یہ کہ کسی طرح ان کی قوم پھر سے سنگٹھت ہو کر آزادی کے میدان میں آ کھڑی ہو۔ ۱۸۸۰ء تک یعنی اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک وہ برابر اسی کام میں لگے رہے۔

مولانا قاسم صاحب نانوتہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام مولانا اسد علی تھا۔ انہوں نے حاجی امداد اللہ صاحب اور مفتی صدرالدین صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مفتی صدرالدین اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے عالم اور ولی اللہی جماعت کے دوسرے امام شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ مفتی صاحب کے ایک دوسرے مشہور شاگرد مولانا ابوالکلام آزاد کے والد شیخ محمد خیرالدین صاحب تھے۔ ان کے علاوہ مولانا قاسم صاحب نے کچھ دنوں تک مولانا مملوک علی صاحب سے بھی پڑھا تھا۔

ولی اللہی جماعت کے اماموں میں مولانا قاسم صاحب اسلئے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ ایک طرح سے اس سنگٹھن کی بنیاد ان کو پھر سے جمانی پڑی اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ ظلم کا طوفان جاری تھا۔ وہ ایک عجیب ہمت کے آدمی تھے جو بالکل ناامیدیوں کے اندھیرے میں بھی روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن پیدا کر لیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جد مسلمانوں

میں انگریزی عملداری کے خلاف ایک سنگٹھن بنائے رکھنا ان کا ہی کام تھا. وہ سب سے اوپر ملک کی آزادی کو جگہ دیتے تھے اور اس کے لئے سب کچھ قربان کر سکتے تھے.

۱۸۷۸ء ان کی موت کے وقت ولی اللہی جماعت کے سنگٹھن کی نیو پھر سے کافی جم چکی تھی. اس کے لئے اب ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو ان کے بعد اس کام کو سنبھال لے. مولانا قاسم صاحب کی نگاہ تو اس سلسلہ میں دارالعلوم کے سب سے پہلے ودّیارتھی مولانا محمود الحسن پر تھی جو اپنی تعلیم پوری کرکے مدرسہ دیو بند میں ہی ایک مدرّس ہو گئے تھے لیکن ابھی ان کی عمر تھوڑی ہی تھی اس لئے کچھ دنوں کے لئے یہ بوجھ حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی نے سنبھالا. رشید احمد صاحب ایسے بے دھڑک آدمی تھے کہ جب مولانا سعد الدین صاحب کاشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب نے ان سے ہندستان کے 'دارالحرب' ہونے کی بابت پوچھا تو انھوں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ ہندستان 'دارالحرب' ہے. اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انگریزوں سے لڑائی جاری ہے اور ہر ایک مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہے کہ اس لڑائی میں پورا حصہ لے.

حاجی رشید احمد صاحب ۱۹۰۵ء تک زندہ رہے. ان کے بعد مولانا محمود الحسن صاحب نے ولی اللہی جماعت کی امامت کا بوجھ سنبھالا.

حاجی رشید احمد گنگوہی

۱۸۸۰ء میں ولی اللّٰہی جماعت کے پانچویں امام مولانا محمد قاسم صاحب کا انتقال ہو جانے پر جب اس سنگٹھن کو ایک بڑے نیتا کی ضرورت ہوئی تو سب کی نظر مولانا محمود الحسن پر پڑی۔ مولانا محمود الحسن ولی اللّٰہی جماعت کے نئے مرکز مدرسہ دیوبند کے پہلے ودیارتھی تھے۔ ولی اللّٰہی سنگٹھن کے اصول اور ارادوں کی پوری پوری تعلیم ان کو خاص طریقے پر، مولانا قاسم صاحب نے دی تھی۔ اس تعلیم کی ہی بدولت مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنی پڑھائی کے زمانے سے ہی ملک کی آزادی کے لئے تجویزیں سوچنا اور ان پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی دور اندیشی، نڈرپن اور پاک صاف چال چلن کی وجہ سے اپنے حلقے میں وہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس لئے ان کو امام بنانے اور ماننے میں انکار کس کو ہوتا؟ لیکن وہ زمانہ بہت نازک تھا۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کی ناکامیابی اور اس کے بعد ہونے والے بھیانک ظلموں نے بڑوں بڑوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ خاص کر مسلمانوں میں تو لوگ سیاست تو کیا، مذہبی باتوں کی چرچا کرنے میں بھی ڈرتے تھے۔ اس حالت سے فائدہ اٹھا کر کچھ موقعہ پرستوں نے اسلام کے نام پر نئی نئی باتوں کو گڑھنا اور پھیلانا شروع کر دیا تھا، یہاں تک کہ انگریز اور انگریزی

راج کے لئے وفاداری بھی اسلام کے اصولوں میں شریک کرلی گئی تھی۔

وہ حالت مجبور کرتی تھی کہ اس وقت ولی اللّٰہی جماعت کی کمان کسی ایسے آدمی کے ہاتھ میں ہو، جس کو اس سنگھٹن سے باہر کے بھی مسلمان جانتے اور مانتے ہوں اور جس کی رائے و فیصلے کی تمام ہندستان کے مسلمانوں میں وقعت ہو، اور ساتھ ہی ساتھ جس میں ملک کی آزادی کے لئے سچی تڑپ ہو اور جو مسلمانوں میں انگریزوں کی وفاداری کا پرچار کرنے والوں کا ہمّت کے ساتھ مقابلہ کرسکے۔

ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھ کر فیصلہ کیا گیا کہ ابھی کچھ دنوں تک حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی پر امامت کا یہ بوجھ ڈالا جائے۔ حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ ان کی پوری عمر ہی ولی اللّٰہی سنگھٹن کے اُصولوں کو سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے میں بیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گنگوہی صاحب کے والد جناب ہدایت اللہ صاحب انصاری ایک سچے اور دین دار مسلمان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا بیٹا بڑا ہوکر ملک اور قوم کی خدمت کرے۔ اس لئے اُنھوں نے گنگوہی صاحب کو بہت چھوٹی عمر میں ہی پڑھنے کیلئے دہلی بھیج دیا تھا، جہاں وہ ولی اللّٰہی سنگھٹن کے خاص نیتا مملوک علی صاحب سے پڑھتے تھے اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُس زمانے کی سیاست اور انگریزوں کی راج کاجی چال بازی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے

تھے. اسی زمانے میں اُن کی جان پہچان مولانا محمد قاسم صاحب سے ہوئی، جو اسی مدرسے میں پڑھتے تھے اور رشید احمد صاحب کی طرح اپنے تیز ذہن کے لئے مدرسہ بھر میں مشہور تھے.

اس مدرسہ کی تعلیم کا رشید احمد صاحب اور مولانا قاسم صاحب پر بہت گہرا اثر پڑا اور پڑھائی سے فارغ ہونے سے پہلے ہی دونوں نے ملک کی آزادی کے لئے کام کرنا شروع کردیا. اس زمانے میں دلّی کا یہ مدرسہ ملک بھر کے انقلابیوں کا ایک خاص مرکز بنا ہوا تھا. انقلابیوں کے سب سے بڑے نیتا حاجی امداد اللہ صاحب تھے جو رشید احمد صاحب و مولانا قاسم صاحب کے بھی استاد رہ چکے تھے. حاجی امداد اللہ صاحب چاہتے تھے کہ ولی اللّٰہی سنگٹھن کو جلدی سے جلدی انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کردینا چاہیئے. اس کے لئے انہوں نے ایک جنگی کمیٹی بھی بنالی تھی، جس میں حاجی امداد اللہ صاحب کے علاوہ مولانا عبدالغنی، مولانا محمد یعقوب، رشید احمد صاحب اور مولانا قاسم صاحب بھی تھے. کچھ دنوں کے بعد جب حاجی امداد اللہ صاحب کو ولی اللّٰہی جماعت کا یہ تھا امام چنا گیا، تو یہی چار آدمی اُن کے وزیر مقرر کیے گئے. اس سے ظاہر ہوتا ہے قاسم صاحب کی طرح حاجی رشید احمد صاحب نے بھی کتنی جلدی ولی اللّٰہی سنگٹھن میں اپنے لئے یقین پیدا کرلیا تھا.

اس کے بعد کچھ دنوں تک رشید احمد صاحب جگہ جگہ گھوم کر عام جنتا میں بیداری پیدا کرتے رہے. ان کو مذہبی

باتوں کی بڑی گہری جانکاری تھی۔ حدیث میں تو اُن کا لوہا بڑے بڑے عالم بھی مانتے تھے۔ ان کی عملی زندگی بھی بڑی پاک صاف تھی۔ نہایت سادگی کا رہن سہن سب سے میٹھا برتاؤ غریب و امیر سب کو ایک نظر سے دیکھنا اور ملک کے کام سے جو وقت بچے اُسے خدا کی یاد میں لگانا یہ سب ایسی باتیں تھیں جو اُن کی جان پہچان میں آنے والے ہر ایک انسان پر گہرا اثر ڈالتی تھیں۔ اسی سے جب وہ ملک کا دکھ درد بیان کرتے تھے تو سننے والوں پر پورا پورا اثر پڑتا تھا اور اُن کے دلوں میں آزادی کے لئے کچھ کرنے کی خواہش پیدا ہونے لگتی تھی۔ اس طرح رشید احمد صاحب نے اپنے پرچار سے ہزاروں آدمیوں کو آزادی کی لڑائی کا سپاہی بنا دیا۔ دھیرے دھیرے ۱۸۵۷ء میں وہ زمانہ بھی آ گیا، جس کا اتنے دنوں سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ لیکن ولی اللہی سنگٹھن میں اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس انقلاب میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ یہ انقلاب اُن لوگوں کی طرف سے شروع کیا گیا ہے جو ملک میں کسی ایک آدمی کی بادشاہت چاہتے ہیں جبکہ شاہ ولی اللہ صاحب پرجاتنتر یعنی جمہوریت کی حکومت چاہتے تھے اس لئے اس لڑائی میں حصہ لینا اپنے اصولوں سے گرنا ہے۔

اس دلیل کے خلاف حاجی امداد اللہ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ ہم جمہوریت کے آج بھی حامی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، لیکن انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لئے ہمیں اس انقلاب میں

پوری طاقت سے حصہ لینا چاہئے۔ چونکہ جب تک انگریز یہاں پر موجود ہیں، تب تک نہ یہاں جمہوریت ہی قائم ہو سکتی ہے اور نہ شاہ ولی اللہ صاحب کے دوسرے اصولوں کو ہی عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کو حاجی امداد اللہ صاحب کے اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی، کیونکہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو لڑائی کی مصیبتیں سہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اس دلیل کے بہانے ان مصیبتوں سے اپنا بچاؤ کر لیا اور ولی اللّٰہی سنگٹھن سے الگ ہو گئے۔ حاجی رشید احمد صاحب بھی چاہتے تو اس وقت اپنا بچاؤ کر سکتے تھے، لیکن وہ اپنے دوست اور ساتھی مولانا قاسم صاحب کی طرح اپنی جگہ پر اڈگ رہے اور انہوں نے آزادی کی اس لڑائی میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اپنے استاد اور امام حاجی امداد اللہ صاحب کے ساتھ وہ بھی شاملی کے مورچے پر انگریزی فوجوں کے دانت کھٹے کرتے رہے، اور تب تک لڑتے رہے جب تک کہ وہ لڑائی میں گھائل ہو جانے کی وجہ سے پکڑ نہیں لئے گئے۔

جیل خانے میں رشید احمد صاحب کو بڑی بڑی سخت تکلیفیں سہنی پڑیں۔ اس وقت لڑائی میں ہزاروں قیدی انگریزوں کے پاس تھے، جن کے کھانے پینے کا انتظام اس وقت کی حالت میں نہ تو ہو ہی سکتا تھا، اور نہ انگریزوں کو اس کی پرواہ ہی تھی۔ ان قیدیوں کے مقدمے بڑی جلدی جلدی نبٹائے جا رہے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو پھانسی پر

چڑھاکر ٹھکانے لگایا جارہا تھا۔ رشید احمد صاحب بھی اس بات کو جانتے تھے کہ مجھے پھانسی کی ہی سزا ملے گی۔ کیونکہ اُن کے جسم پر گولی کا نشان اس بات کا صاف ثبوت تھا کہ انھوں نے اس جنگ میں حصہ لیا ہے۔ پھر بھی نہ اُن کو کوئی فکر تھی اور نہ کوئی افسوس۔ اُنھوں نے تو جس دن اس راہ میں قدم رکھا تھا، اُسی دن اس نتیجے کو جان لیا تھا۔ افسوس تو اُن کو صرف یہ تھا کہ آزادی کی وہ لڑائی ہندستانیوں کی آپسی پھوٹ کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی اور فکر بھی اُن کو صرف یہ تھی کہ کسی طرح ولی اللّٰہی سنگٹھن کے کچھ ایسے خاص نیتا انگریزوں کے پنجوں سے بچ جائیں جو اس کے بعد بھی ولی اللّٰہی تحریک کو چلاتے رہیں اور آزادی کے جھنڈے کو اونچا اُٹھائے رکھیں۔

کہا جاتا ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے رشید احمد صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُن کے مقدمے کا نمبر آنے سے پہلے ہی عام معافی کا اعلان ہو گیا اس اعلان کے مطابق رشید احمد صاحب بھی رہا ہوئے۔ جیل سے نکلتے ہی اُنھوں نے پھر اپنا پرانا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ پتہ لگایا کہ ولی اللّٰہی سنگٹھن کے کون کون سے نیتا پھانسی کے تختے کی نظر ہو گئے اور کون کون سے بچ سکے ہیں۔ ان کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ سنگٹھن کے سب سے بڑے نیتا حاجی امداد اللہ صاحب صحیح سلامت مکہ پہونچ گئے ہیں اور

مولانا قاسم صاحب بھی پکڑے نہیں جا سکے ہیں۔

اس کے بعد حاجی رشید احمد صاحب فوراً مولانا قاسم صاحب سے ملے اور اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ اب پھر سے آزادی کی لڑائی کس طرح شروع کی جائے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بھی خط و کتابت کرنے میں سپھل ہو گئے اور اب وہاں سے باقاعدہ صلاح مشورہ ملنے لگا۔ اسی صلاح کے مطابق ولی اللّہی سنگٹھن پھر سے قائم کیا گیا اور اس کے سب سے بڑے نیتا مولانا قاسم چنے گئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں دیو بند کا مدرسہ بھی قائم کر دیا گیا۔ اس وقت یہ مدرسہ قائم کر لینا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اور خاص طور پر کسی ایسے آدمی کا تو اس طرح کے کاموں میں حصہ لینا بہت ہی خطرناک تھا۔ جو بغاوت کے الزام میں گرفتار ہو چکا ہو۔ لیکن رشید احمد صاحب نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہیں کی اور نہایت نڈرتا سے ان تمام کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

دیو بند کا مدرسہ قائم ہو جانے کے بعد جب کچھ لوگوں نے یہ کوشش کی کہ دیو بند کا مدرسہ انگریز سرکار سے کچھ روپئے پیسے کی مدد مانگے، تو مولانا قاسم صاحب کے ساتھ ساتھ رشید احمد صاحب نے بھی بات کی سخت مخالفت کی۔ رشید احمد صاحب تو دیو بند کے مدرسہ کو آزادی کے سپاہیوں کی ایک خالص چھاؤنی کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے ایک بار انہوں نے یہ بھی رائے

ظاہر کی تھی کہ مدرسہ دیوبند میں فلسفے کی تعلیم دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی وہ چاہتے تھے کہ نوجوانوں کو صرف وہی باتیں پڑھائی جاویں جو اُن میں کیریکٹر اور مذہب و وطن کی محبت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوں۔ وہ سپاہی چاہتے تھے عالم یا پنڈت نہیں۔ مطلب یہ کہ ولی اللّٰہی سنگٹھن میں بھی اپنے زمانے میں وہ گرم دل کے لوگوں میں سے تھے۔

۱۸۸۰ء عیسوی میں اپنے بچپن کے ساتھی مولانا قاسم صاحب کا انتقال ہو جانے سے رشید احمد صاحب کو بہت گہرا دھکا لگا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو بھائی کی طرح پیار کرتے تھے اور ملک کی آزادی کی لڑائی میں دونوں نے ساتھ ساتھ حصّہ لیا تھا۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے یقین اور عزّت تھی اور خاص طور پر رشید احمد صاحب تو قاسم صاحب کو اپنا نیتا بھی مانتے تھے، اور اُن پر غیر معمولی بھروسہ رکھتے تھے۔ اسی لئے قاسم صاحب کے انتقال کی خبر پاتے ہی رشید احمد صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا، "سالار قافلہ چل بسا، جو کسی دن خود بھی شہید ہوتا اور ہم کو بھی قربان کراتا!"

رشید احمد صاحب کے ان لفظوں میں اُن کی آنکھوں کے نجانے کتنے سپنے بول رہے تھے۔

مولانا قاسم صاحب کے انتقال کے بعد رشید احمد صاحب سے جب امامت کا بوجھ سنبھالنے کو کہا گیا، تو وہ انکار نہ کر سکے۔ ان دنوں وہ گنگوہ میں رہتے تھے اور کبھی کبھی

دیوبند آکر مدرسے کے ودیارتھیوں کو درس (پاٹھ) دے جایا کرتے تھے، یا جو ودیارتھی مدرسے کی پڑھائی سے فارغ ہوکر گنگوہ پہنچتے تھے، اُن کو پڑھا دیا کرتے تھے۔ اس طرح سے انہوں نے قریب تین سو ودیارتھیوں کو تعلیم دی، جن میں سے کچھ نے آگے چل کر ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ایسے لوگوں میں ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام مولانا محمود الحسن صاحب، مشہور کرانتکاری مولوی عبیداللہ سندھی، موجودہ زمانے میں جمعیت کے بہت بڑے لیڈر مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا نام مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

رشید احمد صاحب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح ہندستان کے مسلمان انگریزوں کی چال بازیوں سے بچے رہیں اور ہندستان میں آزادی کی لڑائی میں سب سے آگے بڑھ کر حصّہ لیں۔ اسی وجہ سے اُن کو ایسے لوگوں سے بڑی چڑھ تھی، جو انگریزی راج کی وفاداری کا مسلمانوں میں پرچار کرتے تھے، یا ایسے لوگوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے جو انگریزوں کی مخالفت کرتے تھے۔ بدقسمتی سے ایسے لوگوں میں سر سید احمد صاحب بھی تھے، جن کی شاندار شخصیت کے آگے بڑے بڑے سر جھکاتے تھے، لیکن حاجی رشید احمد صاحب سے اُن کی کبھی نہ پٹ سکی، یہیں تک نہیں، بلکہ کچھ برسوں کے بعد کانگریس کی مخالفت کرنے کے لئے جب سر سید صاحب نے 'انجمن اسلامیہ' قائم کی اور مسلمانوں کو کانگریس سے نکل کر اس میں شریک ہونے کی دعوت دی، تو حاجی صاحب نے

ایک فتویٰ دیکر یہ اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونا چاہیئے، انجمن اسلامیہ میں نہیں۔ یہاں پر یہ بات بھی صاف کر دینا ضروری ہے کہ نہ تو حاجی رشید احمد صاحب خود کانگریس میں شریک تھے اور نہ اُس وقت کی کانگریس کا پروگرام اُن جیسے گرم دل کے دیش بھگت کو پسند ہی آسکتا تھا۔ پھر بھی اتنا تو صاف تھا ہی کہ کانگریس انگریزوں سے ہندستانیوں کو کچھ حق دلوانا چاہتی تھی۔ سر سیّد احمد صاحب اور اُن کے ساتھی اس بات کو بھی ناپسند کرتے تھے اور صرف اس بات کا پرچار کرتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے ہر ایک کام سے یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ وہ انگریزی راج کے پورے پورے وفادار ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حاجی رشید احمد صاحب نے کانگریس کی حمایت کرنا ضروری سمجھا۔

اس کے کچھ دن بعد جب مولانا سعد الدین صاحب کاشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب نے حاجی صاحب سے ہندستان کے دار الحرب ہونے یا نہ ہونے کی بابت فیصلہ مانگا، تو حاجی صاحب نے ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل بہادری اور ہمّت کے ساتھ یہ فتویٰ دیا کہ ہندستان 'دار الحرب' ہے۔ اس فتویٰ کا کچھ حصّہ اس طرح سے تھا۔

'اکنوں حالِ ہند را خود غور فرمایند کہ اجرائے احکامِ کفّار نصاریٰ دریں جا بچہ قوت و غلبہ ہست: اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کرد کہ در مسجد جماعت ادا نکنید، ہیچ مرد از امیر و غریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید۔

× × بہر حال تسلّطِ کفّار بر ہند دریں جا است کہ

دریں وقت کفار را بر دار حرب زیادہ ازیں نبود ۔ و ادائے مراسم اسلام از مسلمانان محض بہ اجازت ایشاں است و از مسلمانان عاجز تر رعایا کسے نیست"۔

یعنی "اب ہندوستان کی حالت پر آپ خود غور کریں کہ اس ملک میں عیسائی کافروں کے قانون اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ اگر ایک ادنیٰ سا کلکٹر بھی یہ حکم کر دے کہ مسجدوں میں اکٹھے ہو کر نماز نہ پڑھی جائے، تو پھر کسی امیر غریب کی یہ ہمت نہیں پڑ سکتی کہ وہ مسجد میں نماز پڑھ سکے۔

× × بہر حال ہندوستان پر کافروں کا اختیار اس درجے تک بڑھا ہوا ہے کہ کسی وقت بھی کسی 'دار الحرب' پر اس سے زیادہ کافروں کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہاں پر جو اپنے مذہبی کام مسلمان کرتے ہیں وہ صرف کافروں کی اجازت سے۔ مسلمان یہاں کی سب سے زیادہ دکھی رعایا ہے"۔

یہ فتویٰ حاجی رشید احمد صاحب نے اس زمانے میں دیا تھا جب سوراج کا نام لینے پر لوگوں کو لمبی لمبی سزائیں دی جاتی تھیں اور کتنے نوجوانوں کو صرف اس لئے کالے پانی کی سزا دی گئی تھی کہ اُن کی غیبی نظموں سے ملک کو آزاد کرنے کا جذبہ اُبھرتا تھا۔

اسی طرح حاجی رشید احمد صاحب ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان کے مسلمان آزادی کی لڑائی میں پورے طور سے حصہ لیتے رہیں لہٰذا اس کے لئے اگر غیر مسلموں کو بھی ساتھ لینا پڑے، تو ان کو بھی بنا کسی ہچک کے ساتھ میں لیں۔ وہ ۱۸۵۷ء جیسی فضا ایک بار پھر ملک میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں رہنا ہر وقت اُن کے دل

میں کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ ملک کی آزادی کے لیے لڑتے ہوئے ہی شہید ہوں۔ جب بھی کوئی ایسا موقع آیا، اُنھوں نے کبھی اپنا پاؤں پیچھے نہ ہٹایا۔ اپنے ہر ایک شاگرد اور مُرید کو بھی وہ یہی تعلیم دیتے تھے۔ جب وہ اپنے کچھ خاص شاگردوں کو اس میدان میں مرتے دیکھتے تھے، تو اُن کو بڑی تسلّی اور خوشی ہوتی تھی۔

حاجی رشید احمد صاحب کا انتقال ۱۱؍ اگست ۱۹۰۵ء عیسوی دن شکروار کو قریب ۸۹ برس کی عمر میں ہوا۔ اُس وقت تک ہندستان میں ایک نئی لہر پیدا ہو چکی تھی اور تلک جیسے نیتا نہایت صاف صاف لفظوں میں ہندستان کی آزادی کی مانگ کر رہے تھے، جس کے اثر میں آکر بہت سے نوجوانوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیاروں کو بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس جُرم میں انگریز سرکار بہت سے نوجوانوں کو پھانسی پر بھی چڑھا چکی تھی، لیکن یہ آگ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس وقت تک ولی اللّٰہی سنگٹھن بھی کافی مضبوط ہو چکا تھا اور حاجی رشید احمد صاحب کے خاص مُرید مولانا محمود الحسن صاحب کی لیڈری میں ہندستان میں انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی شروع کر دینے کی کافی زوردار تیاریاں کر رہا تھا۔

اس طرح حاجی رشید احمد صاحب کو اپنی زندگی میں ہی اپنے مشن کی کامیابی دیکھنا نصیب ہو گیا تھا اور مرتے وقت اُن کو یہ پورا اطمینان تھا کہ اب ہندستان زیادہ دنوں تک غلام نہیں رکھا جا سکے گا۔

مولانا محمود الحسن

ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام مولانا محمود الحسن صاحب نے جماعت کی باگ ڈور پوری طرح تو ۱۹۰۵ء میں حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی کے مرنے کے بعد اپنے ہاتھ میں لی. پر اِس تحریک میں کام کرنا اُنھوں نے مولانا قاسم صاحب کے سامنے شروع کر دیا تھا اور اُن کے کام کو دیکھ کر مولانا قاسم صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ ولی اللہی تحریک مولانا محمود الحسن صاحب کی لیڈری میں اچھی طرح پھل پھول سکے گی۔

مولانا محمود الحسن صاحب کی پیدائش ۱۲۶۸ھ میں دیوبند میں ہوئی تھی. اُن کے باپ مولانا ذوالفقار علی خان اور تاؤ مولانا مہتاب علی صاحب ولی اللہی تحریک کے پرانے مددگار تھے اور اُن اِنے گنے آدمیوں میں سے تھے جن کی مدد سے ہی ۱۸۶۷ء کے اُس زمانے میں مولانا قاسم صاحب اِس مدرسے کو قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے. مدرسے کے سب سے پہلے ودیارتھی بھی مولانا محمود الحسن ہی تھے. کچھ ہی دنوں میں مولانا قاسم صاحب نے اپنے اِس غیر معمولی شاگرد کی چھپی طاقت کو پہچان لیا اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جماعت کے اصلی اصول اور اُن کے مقصد بھی اُنھیں سمجھا دیے. کتنی ہی راتیں مولانا محمود الحسن صاحب نے اِس

کہانی کو سُننے میں بتا دیں جس کی ایک ایک گھٹنا شہیدوں کے خون کے ذکر سے گونج رہی تھی۔ اس طرح بچپن میں ہی اُن کے دل میں ملک کی آزادی کی لگن پیدا ہوگئی اور اُنھوں نے یہ ٹھان لیا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک پل اسی کام میں تیاگیں گے۔

۹ر جنوری ۱۸۷۳ء کو دیوبند مدرسے کے جن پانچ ودیارتھیوں کے سر پہ فضیلت کی پگڑی بندھی یعنی جنھیں ڈگریاں ملیں، اُن میں ایک وہ بھی تھے۔ اس کے بعد اُنھوں نے مدرسے میں ہی بنا تنخواہ پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۸۷۵ء میں صرف پچیس روپئے ماہوار پر وہ مدرسے کے چوتھے مدرّس ہوئے اور اُنھوں نے دیوبند کے ودیارتھیوں میں اپنا کام شروع کر دیا۔

۱۸۷۹ء میں اُن کے اُستاد مولانا قاسم صاحب اچانک چل بسے۔ اس کا اُن پر گہرا اثر ہوا۔ مولانا قاسم صاحب اُن کو اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے۔ اس کے ایک سال بعد اُنھوں نے دیوبند کے کچھ اُستادوں اور طالب علموں کو ملا کر 'ثمرۃ التربیت' کے نام سے ایک نئے سنگٹھن کی نیو ڈالی۔ خوش قسمتی سے ولی اللٰہی جماعت کے چوتھے امام حاجی امداد اللہ اُس وقت تک مکّہ میں زندہ تھے۔ مولانا محمود الحسن حج کے بہانے اُن کے پاس مکّہ گئے اور اُن سے اپنے پروگرام کی بابت ہدایتیں حاصل کیں۔ اس کے بعد مولانا ہندستان واپس آگئے۔

اُس وقت ہندستان میں پھر ایک نئی راج کاجی ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ برٹش حکومت بھی اُسے مٹا دینے کے

لئے پردے کی اوٹ سے آئے دن ایک نئی چال چل رہی تھی.
حکومت کو سب سے بڑی گھبراہٹ یہ تھی کہ آزادی کی جو لگن ابھی تک مسلمانوں میں ہی زور پر تھی، وہ اب ہندوؤں میں بھی پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ لارڈ لٹن کا زمانہ تھا، جس سے زیادہ تنگ نظر اور ہندستان کے بھلے بُرے کو نہ سوچنے والا وائسرائے اب تک شاید کوئی دوسرا نہیں آیا۔ اسی زمانے میں دکھن کا وہ مشہور کال پڑا، جس میں پچاس لاکھ سے زیادہ ہندستانی مکھیوں کی طرح مر گئے۔ لارڈ لٹن پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ اُس نے ایک طرف تو افغانستان پر چڑھائی کر دی اور دوسری طرف دلّی میں ایک شاندار دربار کرنے کا سر انجام شروع کر دیا۔ بھوکوں مرتے ہندستانیوں کے زخموں پر یہ نمک چھڑکنا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف دکھن میں اور دوسری طرف پنجاب میں انگریزی حکومت کے خلاف لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ تحریکیں جلد ہی دبا دی گئیں، لیکن اس بات کا ثبوت دے گئیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی ہندستان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو برٹش حکومت کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

حکومت نے اس جوش کو دبانے کے لئے ایک طرف کونسلیں قائم کر کے کچھ معمولی سے حق ہندستانیوں کو دئے تو دوسری طرف پریس ایکٹ اور ہتھیار چھیننے کا قانون بنا کر لوگوں کو دبانا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تیسری چال پھوٹ ڈالنے کی تھی، جو پہلی دونوں چالوں سے بھی زیادہ کامیاب رہی اور آج تک جاری ہے۔ بُرا یہ ہوا کہ ملک کے کچھ بڑے بڑے

سمجھ دار اور اثر والے لوگ بھی حکومت کے اس جال میں پھنس گئے اور پھنستے رہے اور ملک کی آزادی کے اس ننھے سے پودے کو، جسے ایک طرف دیو بند کی جماعت اور دوسری طرف دکھن بنگال و پنجاب میں اُٹھتی ہوئی اُمنگیں سینچ رہی تھیں، نقصان پہنچاتے رہے۔

مولانا محمود الحسن ان حالتوں میں بھی برابر اپنے کام میں لگے رہے اور 'ثمرۃ التربیت' کے سنگھٹن کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے رہے، پر وہ کوشش کچھ پھل نہ لاسکی، اس کے بعد اپنے تھوڑے سے چنے ہوئے ساتھیوں کے سہارے وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ اُس وقت اُن کا خیال تھا کہ چونکہ ہندستانیوں سے ہتھیار چھین لئے گئے ہیں اس لئے جب تک کوئی غیر ملکی حکومت ہماری مدد پر نہ ہو، تب تک آزادی کی جنگ شروع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے اُن کی نظر کابل پر گئی۔ ہندستان اور افغانستان کی حدیں ملی ہونے کی وجہ سے وہاں سے مدد ملنا سب سے زیادہ آسان تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندستان کی سرحد پر بسے ہوئے آزاد قبیلوں کی مدد حاصل کرنے کا خیال بھی اُن کے دل میں اُٹھا، کیونکہ وہیں ولی اللہی جماعت کی وہ دوسری شاخ جو ۱۸۲۴ء میں سید احمد بریلوی کے ساتھ ہندستان سے ہجرت کرکے سرحد پر چلی گئی تھی، ابھی تک اپنا کام کر رہی تھی۔ مولانا محمود الحسن نے مدرسہ دیو بند کے اُن طالب علموں کے سہارے جو آزاد قبیلوں سے آئے تھے، اپنا تعلق وہاں سے قائم کیا اور وہ اُس میں کامیاب ہوئے۔ آزاد قبیلوں کے

علاقے کے ایک بڑے اثر والے سردار ترنگ زئی کے حاجی صاحب سے اُن کی پرانی جان پہچان تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں حاجی امداد اللہ صاحب آزاد قبیلوں کی مدد لینے اور ولی اللٰہی جماعت کی ان دونوں شاخوں کو ملانے کی جس کوشش میں ناکامیاب ہوئے تھے، زمانے کی ضرورتوں سے مولانا محمود الحسن اب اُس میں کامیاب ہوئے۔ اب ان آزاد قبیلوں کے دوت اور آدمی برابر اُن کے پاس آنے جانے لگے۔

افغانستان میں اُس وقت امیر حبیب اللہ کا راج تھا۔ مولانا نے فوراً ہی اُن سے اور اُن کے کچھ بڑے بڑے سرداروں اور بھائیوں سے لکھا پڑھی شروع کی۔ ان بھائیوں میں خاص شہزادہ نصر اللہ خاں تھے، جنہوں نے ۱۸۹۶ء میں انگلستان جا کر وہاں کی پارلیمنٹ کے ممبروں اور برٹش سرکار کے افسروں سے بڑے زور کے ساتھ کہا تھا کہ افغانستان کی حکومت میں انگریزوں کا جو دخل ہو وہ فوراً اُٹھا لیا جائے۔ اُن کی بات اُس وقت نہیں سنی گئی، جس سے اُنہوں نے انگریزوں کی مخالفت میں 'جمعیت سیاسیہ' کے نام سے افغانستان میں ایک سنگٹھن بنانا شروع کر دیا۔ مولانا محمود الحسن نے اس 'جمعیت' سے بھی اپنا سمبندھ قائم کر لیا تھا اور اُن کے کچھ افغان شاگرد اُس میں بڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

اس کے بعد اُنہوں نے پھر ہندستان میں اپنے سنگٹھن کو مضبوط کرنے کی طرف دھیان دیا۔ اس وقت تک ہندستانیوں کے دلوں میں انگریزوں اور انگریزی راج کا اتنا ڈر نہیں رہ گیا

تھا۔ ساتھ ہی مولانا محمود الحسن کو مولانا عبید اللہ سندھی و مولانا قاسم صاحب کے دھیوتے محمد میاں انصاری جیسے شاگرد بھی مل گئے تھے۔ مولانا کی سادہ اور محنت کی زندگی، سچائی، خدا پرستی نے کافی اثر پیدا کر لیا تھا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے لوگ اُن کے مرید بن چکے تھے۔

سنہ ۱۹۰۹ء کے آس پاس مولانا کی ہدایتوں کے مطابق اُن کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے مدرسہ دیوبند میں 'جمعیت الانصار' کے نام سے ایک نیا سنگٹھن قائم کیا، جس میں دیوبند کے مدرسے سے نکلے ودیارتھی شریک تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں دیوبند کے مدرسے کا جو شاندار کنووکیشن ہوا اُس میں اس جماعت کے قائم ہونے کا اعلان کیا گیا اور اگلے سال اُس کا سالانہ جلسہ کرنے کا بھی اعلان ہوا۔ اسی اعلان کے مطابق 'جمعیت الانصار' کا پہلا جلسہ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۱۱ء کو مراد آباد میں ہوا، جس میں اس سنگٹھن کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا محمود الحسن کے گرو بھائی مولانا احمد حسن محدث امروہی نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

"بعض نئی روشنی کے شیدائی (پریمی) کہتے ہیں کہ جمعیت الانصار اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نقل ہے، لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں۔ جمعیت الانصار کی تحریک اب سے تیس برس پہلے شروع ہو گئی تھی، اور اُس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے، جو آج علوم (علموں)

کے سرچشمہ (دریا) ہیں اور آفتابِ فنون (ہنر کے سورج) ہیں۔ اور جن کی ذات برکات (برکت والی ذات) پر آج زمانہ جس قدر ناز کرے تھوڑا ہے۔ لیکن یہ تحریک اُس وقت زمانے کی ضرورتوں سے متعلق نہ تھی، اس لئے رک گئی اور آخر اسی کلیہ (اصول) کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو اپنے آپ پیدا کر دیتی ہے، ۱۹۰۹ سے اس انجمن کو دوبارہ زندہ کرکے "جمعیت الانصار" نام رکھا گیا۔ جمعیت الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے، اور نہ کسی ذاتی مقاصد (نجی فائدے) سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق ہے، بلکہ اس کے مقصد وہ ضروری مقصد ہیں جن کی آج کل بہت ضرورت ہے۔"

اس حوالے سے ظاہر ہے کہ جمعیت الانصار ثمرۃ التربیت کا ہی دوسرا روپ تھی۔

ایک طرف مولانا محمود الحسن اپنے سنگٹھن کو مضبوط بناتے جا رہے تھے، دوسری طرف حکومت بھی خاموش نہیں بیٹھی تھی۔ مدرسے کے چلانے والوں نے انگریز سرکار سے روپئے کی مدد لینے سے بار بار انکار کیا تھا، مدرسے کے بانی مولانا قاسم صاحب و اُن کے ساتھیوں کی زندگی کے حالات سرکار کو معلوم تھے۔ حکومت کے دل میں کافی ڈر پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی تجویز پر مدرسہ دیوبند کی انتظامیہ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ہر سال مدرسہ دیوبند کے کچھ طالب علم انگریزی

پڑھنے کے لیے علی گڑھ کالج جائیں اور علی گڑھ کالج کے کچھ طالب علم عربی کی تعلیم کے لئے مدرسہ دیو بند بھیجے جائیں۔ اس تجویز کے مطابق علی گڑھ کالج کے وِدّیارتھیوں کا جو پہلا جتھا دیوبند آیا، اُسی کے ایک وِدّیارتھی انیس احمد کو سرکار نے اپنی طرف پھوڑ لیا اور وہ مولانا محمود الحسن کی تمام ہلچلوں کی رپورٹ حکومت تک پہنچانے لگا۔ اُن دنوں مولانا اور اُن کے ساتھیوں کی خاص بیٹھکیں ایک تہ خانے میں ہوا کرتی تھیں، جس میں سرحد و کابل سے آئے ہوئے وہ لوگ بھی، جو مولانا کے مشن میں شریک تھے، شامل ہوا کرتے تھے۔ انیس احمد کو اس تہ خانے کی بیٹھکوں کا حال تو نہیں معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ اُن آنے جانے والوں کے فوٹو لے کر حکومت تک پہنچاتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو حالانکہ مولانا کے اصلی بھید نہیں معلوم ہو سکے۔ پھر بھی وہ اتنا تو جان ہی گئی کہ مولانا کوئی ایک بہت بڑی سازش انگریزوں کے خلاف کھڑی کر رہے ہیں۔

کچھ دن بعد ہی تُرنگ زئی کے حاجی صاحب نے سرحد پر مدرسے قائم کرنے شروع کیے۔ ولی اللّٰہی جماعت کا اپنے اصولوں کے پرچار کے لیے ایسے مدرسوں کا قائم کرنا ایک پُرانا طریقہ تھا۔ ترنگ زئی کے حاجی صاحب کو اپنے اس کام میں اپنے گاؤں کے پاس میں ہی ایک سچے اور محنتی نوجوان کی مدد بھی حاصل ہو گئی، جو بعد میں بہت مشہور سیاسی لیڈر ہوا۔ یہ نوجوان خان

عبدالغفار خان صاحب تھے، جو آج سرحدی گاندھی کے نام سے تمام ہندستان میں مشہور ہیں۔ لیکن اس بات کو اپنے گنے لوگ ہی جانتے ہیں کہ اُن کو سیاست کے میدان میں کھینچنے والے ولی اللّٰہی جماعت کے ہی ایک ممبر ترنگ زئی کے حاجی صاحب تھے۔

سرکار نے فوراً سرحد کے یہ مدرسے جبراً بند کر دئے اور حاجی صاحب پر کچھ پابندیاں لگانے یا اُن کو قید کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس پر مولانا کی ہدایت کے مطابق حاجی صاحب آزاد قبیلوں میں چلے گئے۔ اُنھوں نے وہاں پٹھانوں کا سنگٹھن شروع کر دیا۔ کچھ دن بعد مولانا محمود الحسن نے مدرسہ دیوبند کے ایک پُرانے ودیارتھی مولانا سیف الرحمان کو آزاد قبیلوں میں سنگٹھن کے لئے ترنگ زئی کے حاجی صاحب کے پاس بھیجا۔ مولانا سیف الرحمان پشاور کے نزدیک کے ہی رہنے والے تھے اور مدرسہ دیو بند میں اُنھوں نے تعلیم پائی تھی۔ کچھ دن ٹونک میں پڑھا کر وہ دلّی میں فتح پوری مدرسے کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ ترنگ زئی کے حاجی صاحب کے پاس پہنچ کر اُنھوں نے پٹھانوں کا کافی سنگٹھن کیا۔ اس کے بعد وہ اسی کام سے کابل چلے گئے۔ پر بعد میں سرکاری دباؤ اور چالوں نے اُنھیں اس صحیح پر خطرناک راستے سے الگ کر دیا۔

مولانا محمود الحسن صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ کابل سے لیکر ہندستان کے ٹھیٹھ دوسرے کونے تک ایک سنگٹھن پھیل جائے۔ وہ سنگٹھن جب پورا ہو جائے تو کابل اور آزاد قبیلوں کی ایک فوج ہندستان پر

حملہ کرے۔ ملک کے بھیتر کا سنگٹھن اس وقت ملک کے بھیتر سے لڑائی چھیڑ دے اور اس طرح انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکا جائے۔

کچھ دنوں بعد جب ٹرکی اور بلکان ریاستوں میں لڑائی چھڑی، تو مولانا اور اُن کی پارٹی نے ٹرکی کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلے کے مطابق ڈاکٹر انصاری صاحب ایک ڈاکٹری مشن لے کر ٹرکی گئے۔

اس کے کچھ دن بعد سنہ ۱۹۱۴ء میں یوروپین جنگ کا اعلان ہوگیا۔ مولانا نے فوراً طے کر لیا کہ برٹش حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کا یہ سب سے اچھا موقع ہے۔ اُنھوں نے اس کے لئے اپنے سنگٹھن کی کڑیاں اور بھی مضبوط کرنی شروع کر دیں۔

اس وقت تک وہ دلّی میں بھی 'نظارۃ المعارف' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کر چکے تھے، جو دراصل ولی اللّٰہی جماعت کے کرانتکاری سنگٹھن کی ایک شاخ تھا۔ اس مدرسے کا نظام مولانا محمود الحسن صاحب کے خاص شاگرد اور اُن کی سیاست کے رازداں مولانا عبید اللہ سندھی پر تھا اور مدرسے کی مدد ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں وغیرہ بھی کرتے رہتے تھے، جو مولانا کے مرید اور اُن کے دوستوں میں سے تھے۔

اسی زمانے میں ہندستان کے ایک دوسرے مولوی عبد الحق حقانی نے یہ فتویٰ دیا کہ ٹرکی کے خلاف انگریزوں کی مدد کرنا جائز ہے۔ اس فتویٰ پر کچھ اور مولویوں کے بھی دستخط تھے۔ کچھ دن بعد یہ فتویٰ دستخطوں کے لئے مولانا محمود الحسن صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ مولانا محمود الحسن ٹھنڈے مزاج کے تھے اور اپنے سیاسی خیال سوا اپنے خاص

شاگردوں کے عام طور پر ظاہر نہیں کیا کرتے تھے ، لیکن جب یہ فتویٰ ایک عام جلسے میں اُن کے سامنے پیش کیا گیا ، تو انھوں نے اپنے مزاج کے خلاف بڑے سخت لفظوں میں اُس فتوے کی برائی کی اور اُسے اُٹھا کر پھینک دیا ۔ اُس زمانے میں یہ ایک عام افواہ پھیلائی گئی تھی کہ انگریزی حکومت ہندستان میں اپنی ذرا بھی مخالفت برداشت نہیں کرے گی اور جو بھی اُس کے راستے میں آوے گا ، اُسے پوری طرح کچل دے گی ۔ مولانا جانتے تھے کہ اس فتوے کے بارے میں چپ رہنا حکومت کی دھمکی کو منظور کر لینا اور تمام ملک کے سامنے ڈر کی ایک بری مثال کھڑی کر دینی ہی ، اس لیے انھوں نے تمام خطروں کو پہچانتے ہوئے بھی اُس کے بارے میں ایسا سخت رویہ اختیار کیا ۔ ان کے اس برتاؤ سے اُن کے ساتھیوں میں بڑی سنسنی پھیل گئی اور لوگ یہ اُمید کرنے لگے کہ مولانا فوراً گرفتار کر لیے جائیں گے ، لیکن اُس وقت حکومت کی ہمّت اُن پر ہاتھ ڈالنے کی نہ ہوئی ، حالانکہ اس کے بعد مولانا کو حکومت کے ہاتھوں اس سے بیسیوں گنی زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑیں ۔

اگست ۱۹۱۵ء میں مولانا نے اپنے خاص شاگرد عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا ۔ عبید اللہ سندھی نے لکھا ہی کہ مولانا نے جب اُن کو کابل جانے کا حکم دیا ، تب کوئی خاص پروگرام اُنھیں نہیں دیا ۔ کابل پہنچ کر اُن کو معلوم ہوا کہ مولانا نے پچھلے بیسیوں برسوں سے وہاں میدان تیار کر لیا تھا ۔ جب عبید اللہ سندھی جنرل نادر خاں سے ملے تب اُن کو یہ دیکھ کر

بہت حیرت ہوئی کہ جنرل نادر خاں اُن کی بابت پہلے سے بہت کچھ جانتے تھے۔ اس کے بعد کابل میں اس جماعت کے کارکنوں نے جو کچھ کیا، اُس کی ایک لمبی کہانی ہے۔ تھوڑے سے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کابل کے تخت سے انگریزوں کے حامی امیر حبیب اللہ کو ہٹا کر اُن کی جگہ انگریزوں کے سخت مخالف امان اللہ خاں کو بٹھانے اور انگریزوں کے پنجوں سے افغانستان کو آزاد کرانے میں بہت بڑا ہاتھ مولانا محمود الحسن اور اُن کے شاگردوں کا تھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے، جسے لوگ پڑھا کر کہی ہوئی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اب زمانہ آگیا ہے کہ اس کے پورے ثبوت بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجنے کے ایک مہینہ بعد ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ کو مولانا محمود الحسن صاحب بھی اپنے کچھ خاص شاگردوں کے ساتھ حج کے بہانے نکل چل دیئے۔ حکومت کو اپنے جاسوس انیس احمد کے ذریعے مولانا کی ان ہل چلوں کی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جب مولانا کو ہندستان سے باہر جاتے دیکھا، تو حکومت کا ماتھا ٹھنکا۔ مولانا کے بمبئی پہنچتے پہنچتے وہاں کے افسروں کو مولانا کی گرفتاری کا حکم بھیجا گیا۔ حکم کچھ دیر سے پہنچا۔ وہ اُس وقت ملا حبیب بھائی بھولا بھزاد مسلمان سمندر کے کنارے کھڑے اپنے اس امام کو بدا کر رہے تھے۔ اس کے بعد جہاز کے کپتان کو مولانا کی گرفتاری کا حکم دے دیا گیا۔ وہ بھی کسی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا

مع اپنے ساتھیوں کے حجاز پہنچ گئے۔ وہاں وہ حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملے اور اُن سے آزاد قبیلوں کے لیے ایک خط حاصل کیا، جس میں ترکی سرکار کو مولانا کا مددگار بتایا گیا اور قبیلوں سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف متحد ہو کر لڑائی چھیڑ دیں۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس خط کا ذکر 'غالب نامہ' کے نام سے کیا گیا ہے۔

غالب پاشا کے اس خط کو مولانا کے ایک خاص شاگرد محمد میاں انصاری لے کر چلے اور ہندستان ہوتے ہوئے آزاد قبیلوں میں وہ خط پہنچا کر کابل پہنچ گئے۔ اس کے بعد مولانا مکہ اور مدینہ پہنچے۔ وہیں مولانا محمود الحسن کے ایک دوسرے شاگرد مولانا حسین احمد صاحب پہلے سے رہ رہے تھے۔ مولانا کو حسین احمد صاحب سے کافی مدد ملی۔

مدینے میں مولانا نے ترکی حکومت کے جنگی وزیر انور پاشا اور ایک دوسرے فوجی افسر جمال پاشا سے ملاقات کی۔ انور پاشا مولانا کی بابت پہلے سے سن چکے تھے۔ انھوں نے مولانا کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "اصلی مدد تو آپ کے ملک کے ہی لوگ دے سکتے ہیں اور اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ آپ غیر مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ لیں۔" انور پاشا کی ان باتوں کا مولانا پر گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے کابل میں کام کرنے والے اپنے ساتھیوں کو یہ سندیسا بھیجا کہ وہ غیر مسلمانوں کو خاص طریقے پر اپنی تحریک میں شریک کریں اور اُن کو ذمہ داری کی جگہیں

دے کر یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ اس تحریک کا مطلب صرف ملک کی آزادی ہی ہے نہ کہ ہندستان پر پھر سے مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا۔ اس سندیسے کے مطابق راجا مہندر پرتاپ کو ہندستان کی اس عارضی سرکار کا پریسیڈنٹ بنایا گیا جو کابل میں مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہ نے قائم کی تھی وہ اس طرح کی پہلی سرکار تھی، جس کی یاد نیتاجی سوبھاش چندر بوس نے جاپان، سیام اور برما میں آزاد ہند سرکار قائم کرکے بیسیوں برس بعد پھر سے تازہ کردی۔

اسی وقت انور پاشا کی صلاح سے یہ بھی طے ہوا کہ مولانا محمود الحسن صاحب خود بھی آزاد قبیلوں میں پہونچیں۔ اس کا انتظام ہو ہی رہا تھا کہ مکہ کا حاکم شریف حسین انگریزوں سے مل گیا۔ اس نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کردیا۔ مولانا اس کا نتیجہ جانتے تھے۔ انھوں نے مکہ سے نکل جانے کی کافی کوشش کی پر ناکام رہے اور مع اپنے ساتھیوں کے ۱۷ ستمبر ۱۹۱۶ کو گرفتار کرلئے گئے۔ اس کے بعد قریب چار سال تک وہ مالٹا کے فوجی قید خانے میں نظر بند رکھے گئے۔ ان چار سال میں ان کو و ان کے ساتھیوں کو جو سخت تکلیفیں اٹھانی پڑیں، ان کو بیان کرنے کے لئے کئی موٹی موٹی جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ شروع میں تو سبھی کو یقین تھا کہ پھانسی دیدی جائے گی اور اسی یقین کے مطابق مولانا کے ایک ساتھی عزیز گل صاحب سرحدی اپنی گردن دبا دبا کر دیکھا کرتے تھے کہ پھانسی کے

وقت کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ بعد میں حکومت نے کسی مصلحت سے پھانسی تو نہ دی پر یہ چار سال کی نظربندی پھانسی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ مولانا اور اُن کے ساتھیوں نے خوشی خوشی یہ سب سہا اور کبھی اپنے ماتھے پر شکن بھی نہیں آنے دی۔ مولانا کے ایک ساتھی حکیم نصرت حسین صاحب کا تو مالٹا ہی میں انتقال بھی ہوگیا۔ آج بھی مالٹا میں ملک کے اس دیش بھگت سپوت کی قبر ایک سنسان جگہ میں بنی ہوئی ہے اور "تنے چراغ نے گلے" اُس دن کا انتظار کر رہی ہے جب آزاد ہندستان اُس کی اہمیت سمجھے گا۔

مئی ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں مولانا محمود الحسن صاحب اس نظربندی سے رہا ہوکر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بمبئی پہنچے۔ اُس وقت تک خلافت کی تحریک شروع ہوچکی تھی۔ حکومت کو ڈر تھا کہ مولانا بھی آکر کہیں اس میں شریک نہ ہوجائیں۔ اس لئے جہاز پر ہی خفیہ پولیس کے کچھ افسر اور ایک کوئی مولوی رحیم بخش صاحب مولانا سے ملے اور ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بمبئی کے کسی استقبالیہ جلوس میں شریک نہ ہوں اور نہ خلافت سے اپنا کوئی سمبندھ دکھا دیں، بلکہ چپ چاپ دیوبند چلے جائیں۔

مولانا نے ان لوگوں کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کو خود جلوس وغیرہ میں شریک ہونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس مشورہ میں جو اشارہ تھا، اس کی وجہ سے اُنھوں نے خلافت کمیٹی کو اپنا سواگت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد تو دیوبند تک ہر اسٹیشن پر اُن کا شاہی استقبال ہوا۔ اس

طرح انھوں نے حکومت کو یہ جتا دیا کہ چار سال کی نظر بندی کی تکلیفیں اُن کی صحت اور جسم پر بھلے ہی کتنا بھی اثر ڈال سکی ہوں، پر اُن کی اُمنگوں پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہے. ملک کی آزادی کی چاہ اب بھی اُسی طرح اُن کے دل میں موجود ہے۔

دیوبند آکر مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے تمام خاص ساتھیوں کو اکٹھا کر کے حکومت کے خلاف لڑنے کا ایک پروگرام اُن کے سامنے رکھا۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ انگریزوں اور انگریزی حکومت کے خلاف اُن کے دل میں جو نفرت ہے، وہ صرف اس وجہ سے تو نہیں ہے کہ ذاتی طور پر اُن کو ان کے ذریعے تکلیفیں اُٹھانی پڑی ہیں۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ مولانا خود اپنی بابت بھی کتنی گہرائی کے ساتھ سوچا کرتے تھے۔

مولانا محمود الحسن نے یہ نیا پروگرام ایسا بنایا تھا، جس میں عام جنتا حصہ لے سکے۔ وہ اب تک یہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ صرف سیاسی سازشوں سے آزادی کی لڑائی آگے نہیں بڑھ سکتی. اسی سچائی کو ہندستان کے دوسرے کرانتی کاریوں نے سنہ ۱۹۲۰-۲۲ء کے بعد سمجھا اور وہ بھی بم پستولوں کا سہارا چھوڑ کر جنتا یعنی کسان مزدوروں کا سنگٹھن کرنے لگے۔ مولانا محمود الحسن نے اس سچائی کو پندرہ برس پہلے سمجھ لیا تھا۔ یہ اُن کی دُور اندیشی کی ایک دوسری مثال ہے۔

نظر بندی کے ان چار برس میں مولانا کی صحت بالکل

گئی تھی، گٹھیا کا درد اُن کو دن رات پریشان کرتا تھا، ساتھ ہی دم دم پر پیشاب جانے کا روگ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ مولانا آرام کریں، لیکن مولانا کو ایک پل کے لیے بھی چین نہیں تھا۔ وہ دن رات گھومتے رہتے تھے۔ ان کے کچھ دن پہلے 'جمعیت العلماء' کے نام سے ایک جماعت قائم کی جا چکی تھی، جو ملک کی آزادی کے لئے ایک کھلا پروگرام جنتا کے سامنے رکھنے کا مشن لے کر شروع ہوئی تھی۔ مولانا نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔ وہ دن رات اس کے سنگٹھن کو مضبوط کرنے کی کوشش میں جٹے رہنے لگے۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو تپ دق ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے پھر یہ بتلایا کہ مولانا کا جسم تھوڑی سی بھی محنت برداشت نہیں کر سکتا، لیکن مولانا کو ایک پل بھی بیکار کھونا گوارا نہیں تھا۔ دن رات بخار میں پھنکتے ہوئے وہ تجویزوں کے مسودے لکھنے و ساتھیوں کو ہدایتیں دینے میں جٹے رہتے تھے۔

اسی زمانے میں علی گڈھ یونیورسٹی کے کچھ آزاد خیال ودیارتھیوں نے اُن سے اپنے جلسے کی صدارت کرنے کی درخواست کی۔ مولانا اس وقت ہلنے جلنے سے بھی مجبور تھے۔ ڈولی میں لیٹ کر وہ اسٹیشن پہنچے۔ اسی حالت میں علی گڈھ تک کا سفر کیا۔ وہاں پہنچکر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جلسے کی صدارت کی۔ یہ اُن کی آخری تقریر تھی، جس میں ملک کی آزادی کے لئے سب کچھ داؤں پر لگا دینے کی اپیل انھوں نے بڑے پُر درد لفظوں میں کی تھی۔ یہ جلسہ علی گڈھ کالج

کے اُن ودّیارتھیوں کا تھا، جنھوں نے خلافت تحریک کے پروگرام کے مطابق علی گڈھ یونیورسٹی اس لئے چھوڑدی تھی، کیونکہ وہ سرکاری مدد پر چلتی تھی۔ اسی وقت مولانا محمودالحسن صاحب کے ہاتھوں سے 'جامعہ ملّیہ اسلامیہ' مدرسے کی بھی نیو رکھی گئی جو آج بھی مدرسہ دیوبند کی طرح دلّی میں قومی تعلیم کا ایک خاص مرکز ہے۔ اس کے ٹھیک ایک مہینے بعد ۳۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ کو دلّی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر مولانا محمودالحسن صاحب کا انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے کچھ گھنٹے پہلے ہی آزاد قبیلوں کے علاقے سے آئے ہوئے کچھ آدمیوں کو اُنھوں نے ہدایتیں دی تھیں اور چونکہ سننے اور بولنے کی طاقت اُس وقت بہت کم ہوگئی تھی، اس لئے مولانا کے منہ پر کان رکھ کر سرحد کے اُن پٹھانوں نے مولانا کی یہ آخری باتیں سُنی تھیں۔

مولانا محمودالحسن صاحب نے اپنی امامت کے زمانے میں پچھلے دو سو برس سے چلی آرہی ولی اللہی تحریک میں دو خاص نئی باتیں کیں۔ پہلی یہ کہ اُنھوں نے غیر مسلمانوں کو شریک کرکے تحریک کو سچّے معنوں میں تمام ہندستان کی تحریک بنا دیا اور دوسری یہ کہ اس میں عام جنتا کو شریک کرکے وہ اُسے ایک نیا راستہ دکھا گئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

ولی اللّٰہی "جماعت" کے چھٹے امام مولانا محمود الحسن صاحب کے اُن ساتھیوں اور شاگردوں میں، جنھوں نے ملک کی آزادی کی لڑائی میں نہایت دلیری کے ساتھ حصّہ لیا، مولوی عبید اللہ سندھی کا نام ہمیشہ بڑی عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنی زندگی کا بہت بڑا حصّہ جلاوطنی کی "دل کنپا دینے والی مشکلوں میں بتانا پڑا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا جنم ۱۰ر مارچ ۱۸۷۲ء کو میانوالی (پنجاب) کے ایک ہندو سے سکھ بنے ہوئے خاندان میں ہوا تھا۔ اُن کے باپ کا نام رام سنگھ تھا، جو سنارگیری اور ساہوکاری کا پیشہ کرتے تھے اور اپنے اس بیٹے کے جنم سے چار مہینے پہلے ہی چل بسے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبید اللہ صاحب کو اپنے باپ کی محبت نہ مل سکی۔ لیکن اُن کے بابا جسپت رام اُن کے پیدا ہونے کے قریب دو سال بعد تک زندہ رہے۔ اس کے بعد عبید اللہ صاحب کی ماں اپنی گرہستی کے ساتھ ننھیال آگئیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے بھائی کے ساتھ جے پور ضلع ڈیرہ غازی خاں چلی گئیں اور وہاں رہنے لگیں۔ یہیں پر مولانا نے شروع کی تعلیم پائی اور یہیں پر ۱۸۸۴ء میں اپنے ایک آریہ سماجی دوست کے ذریعے لی

ہوئی ایک کتاب "تحفۃ الہند" کے اثر میں آکر اُنھوں نے اسلام قبول کرلیا اور گھر چھوڑ کر سندھ جا پہنچے۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔

سندھ پہونچ کر مولانا نے کچھ دنوں تک اسلامی فلسفے کی شرح کی کتابیں پڑھیں جن کی طرف اُن کا خاص رجحان تھا۔ اس کے بعد سکھر اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی کے ساتھ اُن کی شادی ہوگئی۔ مولانا نے اس کے بعد سکھر میں ہی رہنے کا ارادہ کرلیا اور اس کی خبر اپنی ماں کو دے دی۔ ماں جو اپنے بیٹے کے ویوگ میں بے حال ہو رہی تھیں، یہ خبر ملتے ہی سکھر پہنچیں۔ پر اُن کو یہ دیکھ کر بڑا دھکّا لگا کہ اُن کے بیٹے نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ پھر بھی بیٹے کی محبّت کی وجہ سے وہ اُس سے دور رہنے کو تیار نہیں تھیں۔ اسی طرح مولانا کے دل میں بھی اپنی ماں کے لئے عزّت اور محبّت تھی، لیکن جس چیز کو وہ ٹھیک سمجھتے تھے اُسے کسی دُنیاوی محبّت کے لئے چھوڑ دینا بھی وہ گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ اتنا ہونے پر بھی اُنھوں نے کبھی اپنی ماں کو، جو صرف اُن کے ہی آسرے پر تھیں، مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ماں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی برابر اُن کے ساتھ رہ سکیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے حالانکہ اپنے مذہب کو بدلا تھا، لیکن وہ ضروری مذہبی جوش اُن میں بالکل ہی نہیں تھا جو اکثر ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں جانے والوں میں پایا جاتا ہے۔

سندھ میں رہتے ہوئے مولانا کے ہاتھ کچھ کتابیں لگیں جو ولی اللہی جماعت کے دوسرے امام شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل شہید کی لکھی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کے ذریعے مولانا کو سب سے پہلے ولی اللہی جماعت کے اُصولوں کی جانکاری ہوئی اور وہ ان کے بابت کچھ زیادہ معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو اُٹھے۔ اسی سلسلے میں سندھ کے کچھ ایسے لوگوں سے بھی اُن کی جان کاری ہوئی جو ولی اللہی جماعت سے تعلق رکھتے ہوئے ہندستان سے برٹش حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی تیاری کر رہے تھے۔ مولانا نے بھی ان کے کام میں دلچسپی لینا شروع کر دیا اور جب اُن لوگوں کو یہ پکا یقین ہو گیا کہ مولانا ہر طرح سے اعتبار کے قابل ہیں اور اُن کے دل میں ملک کی آزادی کے لئے سچی تڑپ ہے، تو اُن کو یہ بھید بھی بتا دیا کہ ان تمام سنگٹھن کے سب سے بڑے موجودہ نیتا دیوبند مدرسے کے ہیڈ ماسٹر مولانا محمود الحسن صاحب ہیں۔ اتنا معلوم ہوتے ہی مولانا عبید اللہ سندھی دیوبند جا پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے مولانا محمود الحسن صاحب سے پڑھنا شروع کر دیا اور کچھ دن بعد ہی اُنھوں نے مولانا محمود الحسن صاحب کا اتنا یقین حاصل کیا کہ وہ اُن کی گُپ چُپ ہونے والی سیاسی مجلسوں میں بھی شریک ہونے لگے۔

اس وقت مولانا محمود الحسن صاحب کے سامنے ایک خاص کام مدرسہ دیوبند کے ودیارتھیوں میں دیش بھکتی کا پرچار کرنا تھا جس سے آزادی کی لڑائی کے لئے اُن میں سے رنگروٹ مل سکیں۔ اس کام کے لیے اُن کی صلاح سے مدرسہ دیوبند کے ودیارتھیوں

کا ایک سنگٹھن مولانا عبید اللہ نے بنایا، جس کا نام 'جمعیت الانصار' رکھا گیا۔ مولانا عبیداللہ خود اس کے جنرل سکریٹری بنے۔ لیکن اس وقت تک مدرسہ دیوبند میں کچھ ایسے لوگ بھی گھس آئے تھے جن کو برٹش حکومت کی مخالفت کا نام سنتے ہی کپکپی آنے لگتی تھی۔ ایسے لوگوں کو مولانا عبیداللہ سندھی کا دیوبند کے مدرسے میں رہنا کھٹکا اور اُنھوں نے اُن پر طرح طرح کے الزام لگانے شروع کردئے بدقسمتی سے اُس وقت ان الزام لگانے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شریک ہوگئے تھے، جن کو مولانا عبید اللہ بہت عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا عبیداللہ کا من دیوبند سے اوبنے لگا اور وہ سندھ واپس جانے کی سوچنے لگے۔ لیکن مولانا محمود الحسن صاحب اپنے اس شاگرد کی غیر معمولی سچّائی اور دماغی طاقت سے واقف ہوچکے تھے۔ اس لئے انھوں نے سمجھا بجھا کر مولانا عبیداللہ کو دہلی بھیج دیا، وہاں وہ 'ندوۃ المعارف' کے نام سے ایک مدرسہ چلانے لگے۔ اس مدرسے کا ضروری کام کرنے کے لئے خود مولانا محمودالحسن صاحب دہلی پہنچے اور حکیم اجمل خاں صاحب ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ اپنے خاص خاص دوستوں سے مولانا عبیداللہ کی جان پہچان کرا کر اُن سب پر یہ ڈال دیا کہ وہ وقت ضرورت مدرسے کی مدد کرتے رہیں گے۔

جیسا کہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بھی ذکر ہے، دہلی آجانے کے بعد بھی مولانا عبیداللہ مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنے کے لئے برابر دیوبند آتے جاتے رہے۔ اسی بیچ میں مولانا

عبیداللہ نے دلّی میں ایک انقلابی پارٹی کھڑی کی تھی جس کا مقصد ہتھیاروں کے ذریعے انگریزوں کو ہندستان سے باہر نکال دینا تھا۔ یہ ۱۹۱۳ء کا زمانہ تھا اور ہندستان کے دوسرے حصّوں میں بھی خاص کر بنگال اور پنجاب میں اسی طرح کے اور بھی بہت سے سنگٹھن قائم ہو چکے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ان سنگٹھنوں سے بھی اپنا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جس کا ذکر ہندستان کے ایک بہت بڑے کرانتی کاری شری شچیندر ناتھ سانیال نے اپنی کتاب 'بندی جیون' میں کیا ہے۔

اس کے کچھ دن بعد ہی یورپ میں لڑائی کے نگاڑے گنگنا اٹھے۔ مولانا محمود الحسن صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل جانے کے لئے کہا۔ مولانا محمود الحسن صاحب کی عادت تھی کہ وہ نزدیک سے نزدیک کے آدمی کو بھی صرف اتنی ہی باتیں بتاتے تھے جتنی بتانا ضروری ہوتا تھا۔ اس وجہ سے مولانا عبیداللہ نہیں جانتے تھے کہ کابل میں مولانا محمود الحسن صاحب کا کتنا اثر ہے۔ ادھر وہ دہلی میں کافی کام کر چکے تھے۔ اس لئے ان کی رائے کابل جانے کی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے جب ایک دن مولانا محمود الحسن صاحب نے اکسمات ہی مولانا عبیداللہ سے کہا "عبیداللہ! کابل جاؤ" تو عبیداللہ صاحب نے کچھ مزاح کے ساتھ پوچھا "کیوں؟" مولانا محمود الحسن صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئے۔ دوسرے دن بھی انہوں نے مولانا عبیداللہ سے اسی طرح کہا اور مولانا کے کابل جانے کی وجہ پوچھنے پر خاموش ہو گئے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں

تھوڑی سی ناراضگی کی جھلک عبیداللہ صاحب کو محسوس ہوئی. اس سے مولانا عبیداللہ کو بڑا دھکا لگا اور وہ یہ انتظار کرنے لگے کہ اُن کو پھر کابل جانے کا حکم ملے اور وہ اُس کی تعمیل کر سکیں.

دو چار دن بعد ہی مولانا محمود الحسنؒ صاحب نے مولانا عبیداللہ سے پھر کہا — "عبیداللہ کابل جاؤ"! عبیداللہ صاحب نے یہ سنتے ہی "ہاں" کردی اور کابل جانے کی تیاریاں شروع کر دیں. اُس وقت اُن کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ اس سفر کا انتظام کر سکیں، لیکن اس کا ذکر مولانا محمود الحسن صاحب سے کرنا اُن کو اچھا نہ لگا. آخر ان کے ایک شاگرد شیخ عبدالرحیم (آچاریہ کرپلانی جی کے بڑے بھائی) نے اپنی بیوی کے زیور بیچ کر اس سفر کا خرچ جٹایا اور مولانا عبیداللہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر اگست ۱۹۱۵ میں ہندستان کی سرحد پار کرکے کابل کی طرف چل پڑے. راستے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرتے ہوئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا کابل میں داخل ہوگئے. اس وقت اُن کے پاس خرچ کے لئے صرف ایک پونڈ بچا تھا اور اُن کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ آخر اس بیگانے ملک میں اُن کو کیوں بھیجا گیا ہے. اپنی اس حالت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ڈائری میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے "۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا. مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا، اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی. لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا. خدا نے اپنے فضل سے نکلنے

کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ دلی کی سیاسی جماعت کو جب میں نے یہ بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے تو اس نے بھی اپنا نمائندہ مجھے بنا دیا لیکن کوئی معقول پروگرام وہ بھی مجھے نہیں بتا سکے۔" ان لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب ڈسپلن کی پابندی کا کتنا خیال رکھتے تھے

کابل پہنچ کر بھی مولانا عبید اللہ صاحب کو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ شروع شروع میں تو ان کو کابل سرکار نے نظر بند کر کے جیل میں بند کر دیا، جہاں کچھ اور بھی ہندستانی، جو اسی مقصد سے کابل آئے تھے، بند تھے۔ اس کے بعد جرمن ترکش مشن کے ساتھ راجا مہندر پرتاپ کابل پہنچے۔ تب ان تمام ہندستانیوں کے ساتھ مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی رہائی ملی۔ رہا ہونے کے بعد مولانا عبید اللہ جنرل نادر خان سے ملے جن کو مولانا عبید اللہ کے مشن کی خبر پہلے ہی لگ چکی تھی۔ جنرل نادر خان نے مولانا کو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہی کابل میں ایک عارضی آزاد ہند سرکار بنائی گئی اور مولانا عبید اللہ کو اس میں ہوم ممبر کا عہدہ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندستان کی آزادی کے لیے لڑنے والوں کی جو فوج کابل میں کھڑی کی جانے والی تھی، اس کے جنرل بھی مولانا عبید اللہ صاحب کو ہی بنایا گیا۔ اس کے علاوہ ہندستان میں بھی خدائی فوج کے نام سے ایک فوج کا سنگٹھن کرنا طے ہوا، جس کے سب سے بڑے کمانڈر مولانا محمود الحسن صاحب چنے گئے

مولانا عبیداللہ سندھی نے ان تمام فیصلوں کی خبر مولانا محمود الحسن صاحب تک پہنچانا ضروری سمجھا۔ مولانا محمود الحسن صاحب اس وقت مکّے میں تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے پیلے ریشم پر اُن کے لئے ایک خط لکھوایا، جو اس کاریگری سے لکھا گیا تھا کہ دیکھنے میں تو وہ پھول سے معلوم ہوتے تھے، لیکن دراصل اُس میں لڑائی کا تمام نقشہ اور ان تمام کاموں کی رپورٹ تھی۔ یہ ریشم پر کڑھا ہوا خط عبدالحق نام کے ایک وِدّیارتھی کو سونپا گیا، کہ وہ اُسے شیخ عبدالرحیم تک پہنچادے۔ اس کے بعد شیخ عبدالرحیم اُسے مولانا محمود الحسن صاحب کے پاس تک پہنچوادیتے۔ لیکن عبدالحق نے ہندستان میں آتے ہی یہ خط خان بہادر حق نواز خاں کو دے دیا اور خاں صاحب نے اُسے سرمائیکل اوڈائر تک پہنچا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو یہ تمام بھید معلوم ہوگیا۔ مولانا محمود الحسن صاحب مکّے میں فوراً گرفتار کرلئے گئے۔ شیخ عبدالرحیم کے نام بھی وارنٹ نکلا، لیکن وہ فرار ہوگئے۔ انگریزوں نے کابل کے امیر حبیب اللہ خاں پر یہ زور ڈالا کہ وہ مولانا عبیداللہ سندھی اور اُن کے ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالے کردیں۔ امیر حبیب اللہ اس وقت انگریزوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ان تمام لوگوں کو انگریزوں کے ہاتھوں میں دینے کو بھی تیار تھے۔ لیکن امیر کے چھوٹے بھائی نصرت اللہ خاں اور امیر کے لڑکے امان اللہ خاں وغیرہ انگریزوں کے خلاف تھے۔ ان لوگوں نے امیر کو ایسا تو

نہ کرنے دیا۔ پھر بھی مولانا کو گرفتار کرکے کابل کی جیل میں تو ڈال ہی دیا گیا۔ مولانا نے جیل سے بھی اپنے کام کو جاری رکھا اور وہ افغانستان کی اُس پارٹی کی برابر مدد کرتے رہے، جو انگریزوں کے خلاف تھی۔

کچھ دن بعد ۱۹ فروری ۱۹۱۹ء کو امیر حبیب اللہ خان انگریزوں سے ملے رہنے کی اپنی پالیسی کے کارن قتل کر دیئے گئے اور امان اللہ خاں کابل کی گدی پر بیٹھے۔ امان اللہ خاں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عبیداللہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو جیل سے چھوڑ دیا اور مولانا سے اپنے راج کاج معاملوں میں بھی صلاح لینے لگے۔

اس وقت تک یورپ کی بڑی لڑائی ختم ہو چکی تھی، جس میں حالانکہ انگریز جیت گئے تھے۔ لیکن اُن کی تمام طاقت خرچ ہو چکی تھی۔ ادھر ہندستان میں رولٹ بل کے خلاف ستیہ گرہ چالو تھا اور پنجاب میں تو صرف مارشل لا کے بل پر حکومت چلائی جا رہی تھی۔ عبیداللہ صاحب نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت کابل ہندستان پر چڑھائی کر دے، تو کابل اور ہندستان دونوں ہی انگریزوں کے پنجوں سے چھوٹ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے بادشاہ امان اللہ خاں صاحب کے سامنے اپنا یہ خیال رکھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۲ مئی ۱۹۱۹ء کو یکایک افغانستان نے انگریزوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی سرحد کے آزاد قبیلے بھی مولانا عبیداللہ صاحب کے ایک دوسرے ساتھی ترنگ زئی کے حاجی صاحب کی رہنمائی میں انگریزوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ یہ

لڑائی ۲۴ر جولائی تک چلی۔ اس کے بعد انگریزوں کو افغانستان سے صلح کرنی پڑی، جس کے مطابق افغانستان کی مکمل آزادی منظور کی گئی اور اُسے دوسرے ملکوں سے بنا انگریزوں کی اجازت لئے اپنے سمبندھ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کے بدلے میں انگریز سرکار کی طرف سے یہ شرط رکھی گئی کہ کابل کی سرکار مولانا عبید اللہ کو کوئی سیاسی کام کابل میں نہیں کرنے دے گی۔ اس شرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا عبید اللہ نے کابل ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ کابل کی سرکار مولانا کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تیار تھی، لیکن مولانا عبید اللہ صاحب کے دل میں تو ہندستان کی آزادی کی چاہ تھی۔ اس لئے وہ اس شرط کو منظور ہی کیسے کر سکتے تھے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ کابل چھوڑتے ہی اُن کو سخت تکلیفیں خاص کر روپئے پیسے کی بھاری تنگی اُٹھانی پڑے گی۔ لیکن اُنھوں نے کچھ دن بعد ہی کابل چھوڑ دیا۔ اسی بیچ اُنھوں نے ایک خاص کام یہ بھی کیا تھا کہ کابل میں کانگریس کی ایک شاخ قائم کر دی جس کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے گیا سشن میں منظور بھی کر لیا۔ کانگریس کی یہ پہلی شاخ تھی جو ہندستان سے باہر کسی دوسرے ملک میں قائم ہوئی تھی۔

کابل چھوڑنے کے بعد مولانا عبید اللہ روس پہنچے اور قریب سات مہینے تک ماسکو میں رہ کر کمیونزم کے اُصولوں کو پڑھتے اور سمجھتے رہے۔ لیکن وہ کمیونسٹ پارٹی میں شریک نہ ہوئے کیونکہ

خدا پرستی اور دوسری مذہبی باتوں کے لیے اس کمیونزم میں کوئی گنجائش اُن کو نہ دکھلائی دی ۔ اس کے بعد وہ ترکی پہنچے اور وہاں قریب تین سال تک رہے ۔ یہاں اُنھوں نے 'پین اسلامک' کی تحریک پر کافی غور کیا ۔ لیکن اُس میں کامیابی کی کوئی اُمید دکھائی نہیں دی ۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انڈین نیشنل کانگریس میں ہی اسلام کی مذہبی تحریک کو بھی شریک کردیا جائے ۔ اس پر اُنھوں نے ایک کتاب لکھی جو ترکی میں ہی چھپی ۔ اِسی زمانے میں لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب بھی گھومتے گھامتے ترکی پہنچے ۔ مولانا عبیداللہ ہندستان کے ان دونوں نیتاؤں سے ملے ۔ اس کے کچھ دن بعد ہی اٹلی جاکر وہ پنڈت جواہر لال سے بھی ملے اور اُن سے بھی اپنے اس پروگرام پر بات چیت کی ۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ اُس میں اہنسا پر بہت زور دیا گیا تھا ۔ جواہر لال جی نے اپنی مشہور کتاب 'میری کہانی' میں مولانا کے اس پروگرام کو " ہندو مسلمانوں کے سوال کو حل کرنے کی ایک کافی اچھی کوشش " بتایا ہے ۔

اس کے بعد مولانا کچھ دنوں تک اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتے رہے ۔ نہ پاس میں پیسہ ، نہ کوئی ساتھی اور نہ کوئی ہمدرد ۔ برٹش حکومت کے خفیہ ہر وقت مولانا کے ساتھ لگے رہتے تھے اور پریشان کرتے رہتے تھے ۔ پر ان تکلیفوں کے باوجود مولانا اپنی دُھن میں لگے رہتے تھے ۔

کچھ دن بعد مولانا کو معلوم ہوا کہ مکہ میں ایک خلافت

کانفرنس ہونے والی ہے جس میں ہندستان کے نمائندے بھی حصّہ لیں گے۔ مولانا نے اس موقع پر مکّہ پہنچنا ضروری سمجھا اور وہ اٹلی کے راستے مکّے کے لیے چل پڑے۔ وہ جب مکّہ پہنچے، تب تک کانفرنس ختم ہو چکی تھی اور ہندستان کے نمائندے بھی وہاں سے چل دیے تھے۔ اس کے بعد مولانا نے مکّہ میں ہی رہنا طے کیا اور وہیں پڑھنا پڑھانا شروع کر دیا۔

۱۹۳۶ء میں کانگریس نے مولانا کو ہندستان آنے کی اجازت دینے کے لیے آواز اُٹھائی۔ کچھ دن بعد سندھ میں خانبہادر اللہ بخش کی سرکار بنی اور کانگریس کو اپنی اس تحریک میں کامیابی ہوئی۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۷ء کو برٹش حکومت سے مولانا کو یہ اطلاع ملی کہ وہ ہندستان آ سکتے ہیں۔ ۱ر جنوری ۱۹۳۸ء کو مولانا نے پاسپورٹ بھی حاصل کر لیا اور وہ حج کر کے قریب ۲۲ سال بعد اپنی پیاری جنم بھومی کی گود میں واپس آ گئے۔ یہاں آ کر پہلے وہ اپنے تمام پرانے ساتھیوں سے ملے اور اُس کے بعد دلّی میں رہ کر شاہ ولی اللہ کے اصولوں کا پرچار کرنا اُنھوں نے شروع کر دیا، جو وہ اپنی آخری سانس تک کرتے رہے۔ جلا وطنی کی تکلیفیں اور پریشانیاں اُن کے دیش بھکتی کے جذبے کو کم نہیں کر سکی تھیں۔

مولانا کا انتقال ۲۱ر اگست ۱۹۴۴ کو دین پور (بھاولپور) میں ہوا۔ اپنے آخری وقت تک وہ ہندو مسلم ایکتا کے زبردست حامی رہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سب سے بڑی خدا پرستی یہی ہے کہ ہم سبھی انسانوں سے، پھر چاہے وہ کسی بھی قوم یا مذہب کے

ہوں، سچے دل سے محبت کریں۔ اپنے ایک مضمون میں اُنھوں نے اپنے اس خیال کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ایمان باللہ یا خدا پرستی کی ایک منزل انسانیت دوستی بھی ہے۔ اگر آدمی یہ مانتا ہے کہ سارے انسان اُسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اور اُس کو خالق سے حقیقی محبت ہے، تو لازمی ہے کہ اُسے اُس کی مخلوق سے بھی محبت ہو۔ اور اگر اُسے اُس کی مخلوق سے محبت نہیں، تو یہ سمجھئے کہ وہ خدا کے محبت کے دعوے میں سچا نہیں۔ ہمارے صوفیائے کرام نے تو خدا پرستی کی عملی شکل میں انسانیت دوستی کو ہی اصل دین قرار دیا تھا۔ اُن کا تو یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ جسے صرف اپنے گروہ اور جماعت سے محبت ہے اور وہ دوسروں کو، جو ہم عقیدہ نہیں ہیں، نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ سچا موحد اور خدا پرست ہی نہیں ہے۔"

کاش! آج کا ہندستان اپنے اس دیش بھگت شہید کے ان سونے کے حرفوں میں لکھے جانے لائق لفظوں کا اصلی مرم سمجھ سکے اور اُن پر عمل کر سکے۔

حاجی فضل واحد

ہندستان کی پچھمی اُتری سرحد پر بسا ہوا قبائلی علاقہ اور اُس میں رہنے والی پٹھان قوم ہمیشہ اس بات کے لئے مشہور رہی ہے، کہ اُس نے کبھی پوری طرح سے نہ تو انگریزوں کی غلامی ہی منظور کی اور نہ اُس نے کبھی برٹش حکومت کو چین سے ہی بیٹھنے دیا۔ انگریزوں نے شروع سے ہی وہاں پر اپنی پوری فوجی طاقت لگائی اور اپنی عادت کے مطابق پٹھانوں میں پھوٹ ڈالنے اور اُن کو پھسلانے، للچانے کی بھی پالیسی برتی۔ لیکن پٹھان کسی نہ کسی سردار کی ماتحتی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرتے ہی رہے۔ انگریزوں کے پرچار نے پٹھانوں کی اس آزادی کی لڑائی کو لوٹ مار کے نام سے بدنام کیا۔ اور اُن کے بہادر نیتاؤں کو بھی لیٹرا اور ڈاکو کی شکل میں جنتا کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حاجی فضل واحد صاحب بھی، جن کو عام جنتا ترنگ زئی کے حاجی، کے نام سے ہی جانتی اور پہچانتی ہے، ہمارے نزدیک سرحد کے اور دوسرے لیڈرے قبائلی سرداروں کی طرح فقط ایک ہمّت ور لیٹرے سردار ہی بن کر رہ گئے، اور اُن کی شخصیت کی بلندی اور ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں اُن کی اہمیت کو صرف انے گنے لوگ ہی جان سکے۔

حاجی فضل واحد صاحب دراصل ولی اللّٰہی آندولن

کے ہی ایک نیتا تھے، جن کی پیری مُریدی کا سلسلہ ولی اللہی جماعت کی اُس شاخ سے ملتا تھا جو ۱۸۲۴ء میں سید احمد صاحب بریلوی کی لیڈری میں انگریزوں کے دوست سکھوں سے لڑنے کے لئے سرحد پر چلی آئی تھی۔ سید احمد صاحب کے مرنے کے بعد اُن کے شاگردوں نے اُن کے کام کو جاری رکھا اور جب ۱۸۴۹ء میں سرحد کا یہ علاقہ انگریزوں کی حکومت میں آگیا، تو ستیانا نام کے "پہاڑی" مقام پر اُنھوں نے اپنی چھاؤنی بناکر انگریزوں سے لڑنا شروع کردیا۔ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے جب اس چھاؤنی کو برباد کردیا تو وہیں کے لوگ پشاور سے اُتر پورب کی طرف بسے ہوئے ملکا گاؤں میں جاکر رہنے لگے۔ اس پر ۱۸۶۳ء کے اکتوبر مہینے میں انگریزوں نے قریب ۵۰۰۰ فوج سے ملکا پر بھی چڑھائی کردی اور دو مہینے کی گھنگھور لڑائی کے بعد ملکا کو تحس نحس کردیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو، جو اپنے کو 'مجاہدین' کہتے تھے، بکھر جانا پڑا اور اُنھوں نے الگ الگ قبیلوں میں جاکر انگریزوں سے لڑنے کے لئے الگ الگ سنگٹھن بنانے شروع کردئیے۔ ان لوگوں میں سے ہی ایک تھے۔ مولانا نجم الدین صاحب، جن کا سرحد کی تواریخ میں 'ملّا ہڈا' کے نام سے ذکر ملتا ہے اور جنھوں نے اپنی زندگی بھر کبھی انگریزوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔

حاجی فضل واحد صاحب ان 'ملّا ہڈا' کے ہی شاگرد اور خلیفہ تھے اس لئے جب 'ملّا ہڈا' کا انتقال ہوا، تو اُن کے تمام شاگردوں اور مُریدوں نے حاجی فضل واحد صاحب کو ہی

اپنا نیتا چنا۔ اُس وقت حاجی فضل واحد صاحب اپنے تمام خاندان کے ساتھ اپنے گاؤں ترنگ زئی میں رہتے تھے۔ ترنگ زئی پشاور ضلع کی چرسڈا تحصیل میں ہے اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں صاحب کے گاؤں اُتمان زئی سے صرف ایک میل کی دوری پر ہے۔ ترنگ زئی گاؤں کے باشندے ہونے کی وجہ سے ہی حاجی فضل واحد صاحب 'حاجی ترنگ زئی' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اپنے گرو کی مسند پر بیٹھ جانے کے بعد مجاہدین کے رواج کے مطابق حاجی فضل واحد صاحب کے لئے ۔ لازمی تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیں۔ اُن کے دوسرے ساتھیوں نے اِس کے لئے حاجی صاحب پر بڑا زور ڈالا۔ لیکن حاجی صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس طرح بنا موقع دیکھے ہوئے لڑتے رہنا وے صرف اپنی بربادی کو دعوت دینا سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس طرح کی لڑائی میں ابھی تک پٹھان قوم اپنے ہزاروں سپوتوں کو کھو چکی ہے۔ لیکن انگریزوں کی طاقت اور حکومت کا پھیلاؤ سرحد میں بڑھتا ہی گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم صرف لڑنے کے لئے ہی لڑتے رہے ہیں جو عقل مندی اور دور اندیشی کی بات نہیں ہے۔ اس لئے اب ہم کو پہلے اپنی طاقت بڑھانی چاہئے اور قبائلی علاقے سے باہر رہنے والے پٹھانوں اور غیر پٹھانوں میں بھی آزادی کی چاہ پیدا کرنی چاہئے، جس سے انگریزوں سے لڑائی چھڑنے پر ہمارے یہ بھائی ہمارے مقابلے میں نہ آویں اور ہم انگریزی حکومت پر کوئی کراری چوٹ کر سکیں۔

سرحد کی تاریخ میں اس طرح حاجی فضل واحد صاحب پہلے لیڈر تھے جنھوں نے پٹھانوں کی آزادی کے مسئلے کو پورے ہندستان کی آزادی کے مسئلے کے ساتھ ملاکر سوچا، اور جہاد کے مذہبی جوش سے الگ رہ کر اس پر ایک سیاسی لیڈر کی طرح غور کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر اسی طرح کی باتیں کوئی دوسرا لیڈر کرتا، تو اس کے ساتھی پٹھان ہی، اپنے اس لیڈر کو انگریزوں کا بھیدیا سمجھتے اور اس کی بوٹی بوٹی اڑا دیتے۔ لیکن حاجی فضل واحد صاحب کی سچائی، نیک نیتی اور خدا پرستی کا اُن کے ساتھیوں پر اتنا گہرا اثر تھا کہ کسی نے بھی حاجی صاحب کے اس خیال کے خلاف چوں تک نہیں کی اور اُن کے کہنے کے مطابق چلنا منظور کر لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع سے ہی، حاجی صاحب نے اپنے ساتھیوں کا کتنا یقین حاصل کر لیا تھا۔

اس کے بعد حاجی صاحب نے پورے ہندستان کی سیاست پر غور کیا اور اُنھوں نے یہ کھوج کرنی شروع کی کہ ہندستان کی سیاسی پارٹیوں میں کون سی پارٹی اُن کی مدد کر سکتی ہے۔ اس وقت دلی کی علمی جماعت کے چھوٹے امام مولانا محمود الحسن صاحب بھی سرحدی صوبے سے اپنا تعلق قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء کے قریب حاجی فضل واحد صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب میں خطوں کے ذریعے کچھ جان پہچان ہوئی۔ پہلے حاجی صاحب نے قبائلی علاقے کے کچھ لڑکوں کو پڑھنے کے بہانے دیوبند بھیجا، اور جب ان لڑکوں سے یہ معلوم کر لیا کہ مولانا محمود الحسن صاحب ہندستان کی

آزادی سچ مچ ہی چاہتے ہیں اور اس کے لئے سب طرح کی قربانی کرنے کو تیار ہیں، تو اُنھوں نے بھی مولانا محمود الحسن صاحب کو اپنا نیتا مان لیا۔ اس طرح ولی اللٰہی جماعت کی ان دونوں شاخوں کا رشتہ، جو ۱۹۲۵-۲۶ء میں ٹوٹ گیا تھا، پھر سے قائم ہوگیا۔

اس کے قریب دو سال بعد حاجی فضل واحد صاحب نے اپنے علاقے میں مدرسے قائم کرنے شروع کئے۔ ان مدرسوں میں یوں دیکھنے کے لئے تو دیوبند کے مدرسے کی طرح مذہبی تعلیم ہوتی تھی، لیکن حاجی صاحب کا ارادہ تھا کہ ان مدرسوں کے ذریعے ہی پٹھانوں میں آزادی کا سندیش پھیلایا جائے۔ تعلیم کے لئے اُس وقت تک سرحد میں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لئے پٹھانوں نے حاجی صاحب کے اس کام کو بہت پسند کیا اور خان عبد الغفار خاں صاحب تو پہلے پہل ان مدرسوں کی وجہ سے ہی قومی کام کے میدان میں آئے۔ اسی لئے خان عبد الغفار خاں صاحب آج بھی حاجی فضل واحد صاحب کو اپنا اور تمام سرحد کا سب سے پہلا سیاسی پیشوا مانتے ہیں۔

حاجی صاحب کے یہ مدرسے کچھ دن تک تو چلے، لیکن اُس کے بعد ہی علی گڈھ یونیورسٹی کے ایک ودیارتھی انیس احمد کے ذریعے انگریزوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ حاجی صاحب کا کچھ تعلق دیوبند کے مدرسے سے بھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرحد کے انگریز حاکموں نے اسکولوں کو زبردستی بند کرا دیا اور حاجی صاحب پر کڑی نظر رکھنی شروع کردی۔ اُس وقت کچھ انگریز حاکموں کی رائے تو حاجی صاحب

کو گرفتار کرلینے کی بھی تھی۔ لیکن سرحد پر حاجی صاحب کا جیسا اثر تھا، اُس کو دیکھتے ہوئے انگریزوں کو ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ صرف اُنھوں نے بہت سے جاسوس حاجی صاحب کے پیچھے لگا دیے۔

حاجی صاحب اس حالت میں بھی گھبرائے نہیں اور اُنھوں نے چپ چاپ اپنے کام کو جاری رکھا۔ اتنی نگرانی ہونے کے باوجود بھی مدرسہ دیوبند اور مولانا محمود الحسن صاحب سے اُن کا تعلق برابر بنا رہا اور وہ پٹھانوں میں آزادی کا پرچار کرتے رہے۔

کچھ دن بعد ہی ۱۹۱۴ء میں یورپ میں لڑائی شروع ہوئی، تو مولانا محمود الحسن صاحب نے حاجی صاحب کو یہ سندیش بھیجا کہ ہم لوگوں کو اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں کے خلاف فوراً لڑائی شروع کر دینی چاہیے۔ یہ سندیش پاتے ہی ۲۰ر جون ۱۹۱۴ کو حاجی صاحب اپنے تمام خاندان کے ساتھ چپ چاپ برٹش علاقے سے نکل کر قبائلی علاقے میں چلے گئے اور اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا ہونا تھا کہ قبائلی پٹھانوں کی فوجیں جگہ جگہ اکٹھی ہونی شروع ہو گئیں، جس کے سُپریم کمانڈر حاجی صاحب چُنے گئے۔ ان فوجوں نے سب سے پہلا حملہ ۱۷ر اگست کو ایلا درّے میں ہو کر برٹش علاقے پر کیا اور اُس پر قبضہ بھی کر لیا، جو کئی دنوں تک بنا رہا۔ اس کے بعد اوپری اسمستان کی طرف سے ایک حملہ کیا گیا۔ اور وہاں کی چوکیوں سے انگریزی فوجوں کو بھگا دیا گیا۔ اسی طرح کئی اور حملے بھی جگہ جگہ کیے گئے جن میں انگریزوں کی کئی پلٹنیں

صفا کر دی گئیں۔

ان لڑائیوں سے حاجی صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ہمارے پاس رسد اور ہتھیاروں کا اچھا انتظام نہیں ہوگا، تب تک کامیابی ملنا مشکل ہے۔ ان چیزوں کا انتظام کرنے کے لئے حاجی صاحب نے مولانا محمود الحسن صاحب کو لکھا۔ اس پر مولانا نے اپنے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا اور خود مکہ مدینہ پہنچ کر غالب پاشا وغیرہ سے ملے۔ لیکن کچھ ایسی مشکلیں سامنے آئیں کہ نہ تو حاجی صاحب کو کابل سے ہی مدد مل سکی اور نہ ترکی سرکار سے ہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی صاحب کی تمام فوجیں دھیرے دھیرے بکھر گئیں اور ملک کی آزادی کا اُن کا سپنا پورا نہ ہو سکا۔ اسی بیچ مولانا سیف الرحمان وغیرہ حاجی صاحب کے کچھ ساتھی بھی انگریزوں سے جا ملے اور اُنھوں نے حاجی صاحب کو پکڑوانے کے بھی جال رچے، لیکن حاجی صاحب کی ہوشیاری کی وجہ سے وے اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یورپ کی لڑائی ختم ہوتے ہی ایک طرف تو ہندستان میں رولٹ بل کے خلاف تحریک شروع ہوئی اور دوسری طرف کابل کے نئے بادشاہ امان اللہ خاں صاحب نے ہندستان پر چڑھائی کر دی۔ کابل سے ہونے والی اس چڑھائی میں حاجی صاحب کا پورا ہاتھ پہلے سے ہی تھا، کیونکہ بادشاہ امان اللہ سے یہ طے ہو چکا تھا کہ ہندستان سے انگریز سلطنت ختم کرنے میں ہندستانی

کابل کی مدد کریں گے، جس کے بدلے میں کابل ہندستان کی آزادی منظور کرے گا۔ اسی وجہ سے حاجی فضل واحد صاحب نے اس لڑائی میں بھی پورا حصّہ لیا اور انگریزوں کو گہرا نقصان پہنچایا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد کابل سرکار اور برٹش سرکار میں صلح ہوگئی، جس کے مطابق کابل کی مکمل آزادی انگریزوں نے منظور کرلی۔ اپنی آزادی منظور کراکر کابل کی فوجیں واپس لوٹ گئیں اور حاجی صاحب کو پھر ایک بار ناکامیابی کا کڑوا پھل چکھنا پڑا۔ لیکن پھر بھی وے ہمت کے ساتھ اپنے اصولوں پر جمے رہے اور اُنھوں نے دوسرے قبائلی سرداروں کی طرح برٹش حکومت سے کبھی معافی کی درخواست نہیں کی۔

اس کے بعد ۱۹۲۰-۲۱ء میں تمام ہندستان کی طرح سرحد میں بھی اسہیوگ کی آندھی اُٹھی، جس کی رہبری حاجی صاحب کے پرانے ساتھی خان عبدالغفار خان صاحب کر رہے تھے۔ اُسی بیچ مولانا محمود الحسن صاحب بھی مالٹا کی نظربندی سے رہا ہوکر ہندستان واپس آگئے تھے اور اُنھوں نے اس تحریک میں دلچسپی لینا شروع کردیا تھا۔ حاجی صاحب نے بھی اس آندولن میں دلچسپی لینا شروع کیا۔ لیکن برٹش علاقے سے باہر رہنے کے کارن وے اس میں کوئی خاص حصّہ نہیں لے سکے۔ ہاں، اُنھوں نے اتنا ضرور کیا کہ جب تک اسہیوگ چلتا رہا، اُنھوں نے اپنے اثر کے قبیلوں کو شانت بنائے رکھا، جس سے انگریز حکومت قبائلیوں کی بغاوت کا بہانہ کرکے ان پٹھانوں پر زیادہ ظلم نہیں کرسکی، جو اس تحریک میں حصّہ لے رہے تھے

ابھیوگ کے ہی زمانے میں ہجرت کی بھی آندھی اُٹھی، جس میں ہزاروں مسلمان ہندستان سے نکل کر کابل اور دوسرے دوسرے اسلامی حکومتوں میں بسنے کے لئے چلے گئے۔ حاجی صاحب نے اس وقت ہجرت کرنے والے لوگوں کی پوری پوری مدد کی اور جو لوگ اُن کے علاقے سے ہوکر نکلے اُن کی پوری طرح سے حفاظت کی اسی ہجرت کے سلسلے میں جب خان عبدالغفار خاں صاحب کابل گئے تھے، تب آتے جاتے ہوئے حاجی صاحب سے اُن کی بھی ملاقات ہوئی تھی۔

اس کے بعد حاجی صاحب نے پشتو میں ایک اخبار نکالنا شروع کیا جس کے پشتو نام کا ترجمہ 'چنگاری' ہوتا ہے۔ یہ اخبار شاید پشتو میں نکلنے والا پہلا اخبار تھا جو پہاڑیوں کی چھپی ہوئی گپھاؤں میں چھاپا جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء تک جب تمام ہندستان کی طرح سرحد میں بھی ہندو مسلمانوں کے بیچ تناؤ پھیلا ہوا تھا، تب اس اخبار کے ذریعے حاجی صاحب نے لوگوں کو صحیح راستہ دکھانے میں بہت بڑا کام کیا تھا اس طرح حاجی صاحب ایک پُراثر مولوی، ایک اونچے درجے کے کمانڈر اور ایک دور اندیش لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے اخبارنویس بھی تھے۔

اس کے بعد سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں جب پھر کانگریس نے آزادی کی لڑائی کا اعلان کیا تو حاجی صاحب کی پوری ہمدردی اُن کے ساتھ تھی۔ اور جب سرکاری افسروں نے خدائی خدمت گاروں پر دل ہلانے والے ظلم کرنے شروع کیے، تو بوڑھے حاجی صاحب

نے جون ۱۹۳۰ میں ، مہمندوں اور آفریدیوں کے ایک لشکر کے ساتھ پشاور پر حملہ بول دیا جس نے کچھ سمے کے لئے تو انگریزوں کو بڑی بھیانک مشکل میں ڈال دیا تھا۔

۱۹۳۰ء کے بعد کے کسی سال میں حاجی فضل واحد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس دن سرحد کے انگریز حاکموں نے گھی کے چراغ جلائے اور ابھاگے ہندستانی یہ جان بھی نہ سکے کہ آج ان کے دیش کا ایک ایسا دیش بھکت سپوت ہمیشہ کے لئے ان کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ جو اپنی زندگی بھر ہندستان کی آزادی کے لئے لڑتا رہا اور جس کے نام سے ہندستان کے دشمن تھر تھر کانپتے تھے۔

ولی اللہی تحریک کی تواریخ میں حاجی فضل واحد صاحب کی ایک الگ کہانی ہے جو بہت کم لوگوں کی نظروں میں آئی ہے، لیکن اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور سرحدی صوبے کی سیاست کا تو ان کو پتا کہا جا سکتا ہے

مولانا فضل حق خیرآبادی

مولانا فضل حق خیرآبادی اپنے زمانے کے ایک بڑے رئیس تھے اور اتنے بڑے عالم تھے کہ اسلامی فلسفے میں اُس زمانے میں دو چار آدمی ہی ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ عربی کے شاعر تھے اور اس میدان میں عرب تک میں اُن کا لوہا مانا جاتا تھا۔ لیکن اُنکی موت کالے پانی کی ایک اندھیری کوٹھری میں ہوئی، کیونکہ اُنکو اپنے دیش سے محبت تھی اور اپنے دیش پر وہ کسی دوسرے کی حکومت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔

بہت سے کارنوں سے آج تک اس شہید کا نام اور زندگی کا حال روشنی میں نہیں آسکا۔ لیکن اب وہ زمانہ آگیا ہے، جب ہمیں اپنے اس بھگت شہید کو گمنامی سے نکالکر اُسے وہ عزت دینی چاہیئے جسکا وہ سچا حقدار ہے۔

خاندان کا حال ——— مولانا فضل حق کے بزرگ بہت پُرانے زمانے میں ایران کے کسی صوبے پر حکومت کرتے تھے۔ کسی انقلابی طوفان میں اُن کی وہ حکومت اور شان وشوکت بہہ گئی اور اپنی جان بچانے کے لئے اُن کو ہندستان چلا آنا پڑا۔ اپنی عادت کے مطابق ہندستان نے اُن کو کلیجے سے لگایا اور پھر اُن کے ناتی پوتے کبھی کہیں، اور کبھی کہیں بستے اُٹھتے آخر خیرآباد ضلع سیتاپور میں، آکر مستقل طور پر رہنے لگے۔ اپنی قابلیت سے

کے بل پر یہاں اُنھوں نے ایک اچھی جاگیر حاصل کی اور پھر آس پاس کے علاقے میں ایک بڑے رئیس سمجھے جانے لگے لیکن رئیس ہونے پر بھی جہالت سے ہمیشہ دشمنی رکھی اور اپنے اونچے درجہ کی پڑھائی لکھائی اور بلند کیرکٹر کی بدھی ہی کو ہمیشہ اپنی سچی جائداد سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کی نظر میں بھی یہ خاندان آیا اور مولانا فضل حق کے دادا شاہی نوکری کے سلسلے میں خیرآباد سے دلّی پہنچ گئے۔ اُن کے بعد مولانا فضل حق کے پتا مولانا فضل امام تو عالموں کی محفل کے چراغ سمجھے جاتے تھے۔ وہ دلّی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدر الصدور یعنی سب سے بڑے جج تھے، ساتھ ساتھ شوق اور فرض کے طور پر پڑھاتے بھی تھے۔ اُن کی لکھی عربی کی کئی کتابیں عربی لٹریچر میں آج بھی بہت عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

مولانا کا جنم ——— مولانا فضل حق کا جنم سنہ ۱۷۹۷ میں خیرآباد میں ہوا اور اُنکی پرورش دلّی میں ہوئی۔ اُن کے خاندانی رواج کے مطابق چار سال کی عمر میں اُن کی تعلیم شروع ہوئی۔ مولانا کے پتا کو پڑھانے کا شوق تو تھا ہی۔ وہ شاہی دربار میں پالکی میں جایا کرتے تھے۔ اکثر فضل حق صاحب اُن کے ساتھ ہوتے تھے اور دربار کو آنے جانے میں جو سمے لگتا تھا اُس کا اُپیوگ فضل حق صاحب کی پڑھائی میں ہوتا تھا۔ پھر بڑے ہوئے تو ہندستان کے مشہور انقلابی اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس پڑھنے کے لئے جانے لگے۔ ان کے سرپرستی

تھے مفتی صدرالدین آزردہ، جو ایک دوسرے رئیس کے بیٹے تھے۔ ان دونوں کے مزاج میں شوخی اور گرمی تو تھی، جیسی کہ اکثر رئیسوں کے بیٹوں میں پائی جاتی ہے لیکن شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں پہنچے تو وہاں ایک دوسرا ہی رنگ دیکھا۔ شاہ عبدالعزیز فقیر قسم کے آدمی تھے۔ اُن کا حال یہ تھا کہ جس دن فضل حق صاحب اور صدرالدین صاحب خود کتابیں لے کر آتے اُس دن سبق پڑھا دیتے تھے اور جس دن نوکر کتابیں لے کر آتا تھا، اُس دن پڑھانے سے انکار کر دیتے تھے۔ پھر بھی تیز ذہن ہونے سے ان دونوں کو وہ بہت پیار کرتے تھے۔ مولانا کی یادداشت بہت اچھی تھی اور فلسفے کی باریکیوں میں دماغ خوب چلتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۰۹ میں صرف ۱۳ سال کی عمر میں اُنھوں نے اپنی پڑھائی پوری کر لی اور اپنے پتا کے شاگردوں کو پڑھانے لگے۔

اسی زمانے کی گھٹنا ہے، ایک بڑی عمر کے صاحب مولانا کے پتا کے پاس پڑھنے آیا کرتے تھے، لیکن جب فضل حق صاحب اپنی پڑھائی ختم کر کے خود پڑھانے لگے تو مولانا کے پتا نے اپنے اس شاگرد کو بھی مولانا کے پاس ہی بھیج دیا۔ مولانا نے پہلے ہی دن جب اُنکو بیحد سُست اور کند ذہن دیکھا، تو جھنجھلا اُٹھے۔ کتاب پھینک دی اور کہہ دیا کہ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں ہے، مہربانی کر کے کل سے تکلیف نہ کیجیے گا۔ اس پر وہ صاحب بہت رنجیدہ ہوئے اور اُنھوں نے تمام قصہ مولانا کے پتا کو سنایا۔ فوراً مولانا کی طلبی ہوئی اور جیسے ہی مولانا اپنے پتا کے سامنے پہنچے، اُنھوں نے ایک تھپڑ رسید کرتے

ہوئے کہا "بیوقوف! تو یہ نہیں سوچتا کہ تیرا جیسا دماغ سب کہاں سے پا سکتے ہیں؟ تو مالدار کا لڑکا ٹھہرا! کسی چیز کی کبھی کمی محسوس نہیں کی۔ جس کے پاس بیٹھا اُس نے خاطرداری سے پڑھایا۔ ہمیشہ اچھا کھانے کو، اچھا پہننے کو ملا، لیکن ان بے چاروں کو یہ سب کہاں سے ملے؟" مولانا نے اپنی غلطی محسوس کی اور پھر آئندہ کبھی کسی شاگرد پر ناراض نہیں ہوئے۔

سرکاری نوکری میں ۔ جب کچھ اور بڑے ہوئے، تو انگریز رزیڈنٹ کی عدالت میں سررشتہ دار ہو گئے۔ بادشاہ اکبر شاہ اور رزیڈنٹ دونوں ہی مولانا کو بہت محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

سرکاری نوکر ہوتے ہوئے بھی مولانا نے پڑھانے کا سلسلہ قائم رکھا اور اس میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں شاعری کا شوق ہوا، لیکن اُردو، فارسی کو چھوڑ کر عربی میں شاعری کرتے تھے۔ مشہور شاعر مومن آپ کے شطرنج کے دوست تھے اور غالب صاحب کے ساتھ تو دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ مفتی صدرالدین صاحب سے بھی زندگی بھر نبھی۔ اس طرح نوکری اور پڑھانے سے جو وقت بچتا تھا، تو شطرنج میں جاتا تھا یا شعر و شاعری اور لٹریچر کی چرچا میں۔ شعر کہنے کی ایسی مشق ہو گئی تھی کہ چار ہزار سے اوپر شعر اُنھوں نے کہے ہوں گے۔ مولانا کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ اب مسلم لائبریری علی گڑھ یونیورسٹی میں آ گیا ہے اور کچھ اب بھی اِدھر اُدھر پھیلا

ہوا ہے۔ ان کا کچھ کلام عرب تک بھی پہنچا اور اُس کو وہاں بڑی داد ملی۔ عربی زبان اور عربی شاعری پر مولانا کا اتنا قابو تھا کہ ایک بار اپنے استاد شاہ عبدالعزیز سے بھی اُلجھ گئے۔ مولانا نے ایک قصیدہ شاہ صاحب کو سنایا۔ شاہ صاحب کو وہ پسند آیا، لیکن اس کے ایک شعر پر اُن کو اعتراض تھا۔ اس پر مولانا نے قریب بیس شعر مختلف مشہور شاعروں کے اپنی دلیل کی حمایت میں پڑھ دئے۔ شاہ صاحب نے اپنی غلطی منظور کی اور مولانا کو آشیرواد دے کر وداع کیا۔

کچھ دن بعد دلّی میں ایک نیا رزیڈنٹ آیا، تو اُس نے اپنے محکمے کا ناظم مولانا کو مقرر کیا۔ سنہ ۱۸۲۸ میں جب وہ ولایت کے لئے چلا، تو مولانا مفتی بنائے گئے۔ لیکن اس کے بعد مولانا کی افسروں سے نہیں پٹ سکی۔ اس زمانے کے انگریز جیسی خوشامد چاہتے تھے، مولانا ویسی خوشامد نہیں کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں شاید مولانا کو پہلی بار غلامی کی بُرائی محسوس ہوئی اور انگریزوں کی نوکری اُن کو ذلّت معلوم ہونے لگی۔

دلی سے باہر — اسی ناراضی کی وجہ سے مولانا کو سرکاری وکیل بنا کر الٰہ آباد بھیجا گیا۔ اُس زمانے میں بہادر شاہ "ظفر" ولی عہد یعنی یوراج تھے۔ مولانا جب دلّی سے جانے لگے، تو اُنھوں نے اپنا قیمتی شال مولانا کو اُڑھا دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر وداع کیا۔ مولانا کچھ دنوں سرکاری وکیل کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن

انگریزوں کی طرف سے اب وہ بد دل ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے استعفےٰ دے دیا۔

ریاستوں میں یہ مولانا کے استعفے کی خبر جیسے ہی پہنچی جھجر کے رئیس نواب فیض محمد صاحب نے پانچ سو روپیہ ماہوار پر فوراً مولانا کو اپنے یہاں بلا لیا۔ مولانا کچھ دن وہیں رہے۔ اس کے بعد الور چلے گئے۔ وہاں بھی جی نہ لگا تو سہارن پور پہنچے اور پھر ٹونک کے نواب وزیر الدولہ کے یہاں بھی کچھ دن تک رہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا اتنی ریاستوں میں اس لیے گھومے کہ انگریزوں کے خلاف ان کو لڑنے کے لیے آمادہ کر سکیں۔ لیکن ان رئیسوں اور نوابوں کا خون سرد ہو چکا تھا۔ جس سے مولانا کو بڑی نراشا ہوئی اور پھر لکھنؤ میں آ کر بڑے جج کے عہدے پر کام کرنے لگے۔

لکھنؤ میں اس وقت نواب واجد علی شاہ کی حکومت تھی لیکن دھیرے دھیرے انگریزوں کے پنجے میں یہ ریاست بھی گھستی چلی جا رہی تھی۔ نواب صاحب کو اپنی رنگ رلیوں سے ہی فرصت نہیں تھی، پھر راج کاج کاموں میں کون دماغ خرچ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کا دل یہاں سے بھی اوب گیا اور اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر رام پور کی راہ لی۔ وہاں کچھ دنوں تک نواب یوسف علی کو پڑھاتے رہے۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۸۵۵ء کے آس پاس نواب یوسف علی رام پور کی گدی پر بیٹھے تو مولانا نے کوشش کر کے اپنے دوست غالب صاحب کی راہ رسم رام پور ریاست سے کرا دی

اور نواب صاحب غالب کے پاس اپنی غزلیں اصلاح کے لئے بھیجنے لگے۔ اس کے بعد جب دلّی میں کچھ سرگرمی دکھائی دی اور بادشاہ کی طرف سے راجاؤں نوابوں کے پاس خط آنے شروع ہوئے۔ تو مولانا الور پہنچے اور اُنھوں نے راجا کو بادشاہ کا ساتھ دینے کے لئے سمجھایا۔ لیکن راجا کسی طرح راضی نہیں ہوا۔

آزادی کی لڑائی کے میدان میں۔ مولانا اب خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ فوراً دلّی کی طرف چل دئے اور راستے میں بڑے بڑے زمینداروں سے ملتے گئے اور اُن کو یہ سمجھاتے گئے کہ اس وقت آزادی کی لڑائی میں حصّہ لینے میں ہی اُن کی بھلائی ہی۔ مولانا فضل حق مولانا احمد علی شاہ دلاور جنگ مدراسی سے بھی ملے، یہ مولانا احمد اللہ فیض آبادی کے نام سے بھی مشہور ہیں اور اودھ کی بغاوت میں یہ جس بہادری سے دس مہینے تک انگریزوں سے لڑتے رہے اُس نے اتہاس میں اُن کا نام امر کر دیا ہی۔

دلّی میں۔ کچھ دن بعد مولانا کو معلوم ہوا کہ دلّی اب آزاد حکومت کے ہاتھ میں ہی تو وہ فوراً دلّی پہنچے اور بادشاہ سے ملے۔ شاہی دربار کے منشی جیون لال کے روزنامچے میں کئی جگہ مولانا کا ذکر ملتا ہی اور اُس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ مولانا برابر بادشاہ کے مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

لیکن اُس وقت دلّی کی جو حالت تھی۔ اُس سے مولانا کو بڑی تکلیف ہوئی۔ خود شاہزادوں کی بھی حالت یہ

تھی کہ دن رات لوٹ کھسوٹ پر انکی نظر رہتی تھی۔ گنڈے بدمعاشوں کی بن آئی تھی اور نا قابل لوگ بڑے بڑے عہدوں پر قبضہ کرکے بیٹھ گئے تھے۔

لیکن اس حالت میں بھی روہیلوں کی فوج، جس کا جنرل بخت خان تھا، اپنے دل سے اور سچے جذبے سے لڑائی میں شریک تھی۔ اسی طرح بھروسے لائق ایک دوسرا سنگٹھن مجاہدوں کا تھا۔ جس کی باگ ڈور دلی اللٰہی مولویوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ اکثر مولانا سے ملتے رہتے تھے۔ خاص طور پر جنرل بخت خان مولانا سے مشورہ کرکے ہی کوئی کام کرتے تھے۔ لیکن شاہزادہ مرزا مغل کے سامنے بیچارے بخت خان کی کچھ چلتی نہیں تھی۔ کچھ دن بعد حالت یہاں تک بگڑی کہ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے کمپنی کے پاس معافی کا خط تک بھجوا دیا۔ لیکن انگریزوں نے اس پر بھروسہ نہیں کیا۔

آخر بخت خان کے کہنے پر مولانا خود آگے بڑھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد انھوں نے ایک لمبی تقریر جامع مسجد میں کی اور ایک فتویٰ پیش کیا، جس کے مطابق اس لڑائی میں شریک ہونا ہر ایک مذہبی آدمی کا فرض ہے۔

اس فتویٰ کا جادو جیسا اثر ہوا اور قریب نبّے ہزار سپاہی بادشاہ کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ لیکن شاہی خاندان کے بھرے کے زعم میں جو لوگ تھے، انھوں نے اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا حالت یہ تھی کہ مرزا الٰہی بخش جیسے دغاباز کی پوچھ تھی اور بے

وفاداروں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ مولانا نے اپنی طرف سے کافی زور لگایا۔ لیکن بیچارے اکیلے کیا کرتے۔ آخر ۱۹ستمبر ۱۸۵۷ کو کمپنی کی فوج نے دلّی پر قبضہ کرلیا۔

خانہ بدوشی کی زندگی۔ دلی پر کمپنی کا قبضہ ہوتے ہی مولانا کے تمام ارمان مٹی میں مل گئے۔ اُس کے بعد جو خوں ریزی دلّی میں ہوئی اُس نے ایک بار قیامت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا۔ مولانا نے جو فتویٰ دیا تھا اس کی خبر مخبروں کے ذریعے انگریزوں کو لگ چکی تھی اور مولانا کی بڑے زوروں سے تلاش کی جارہی تھی۔ اسی حالت میں ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ کو مولانا اپنے خاندان کو لے کر چپ چاپ دلّی سے نکل گئے اور بھیکم پور ضلع علی گڈھ کے نواب صاحب کے یہاں پناہ لی۔ وہاں قریب ۱۸ دن رہے اس کے بعد نواب صاحب نے بھیکم پور سے قریب ۸ میل دور سانکرا کے گھاٹ سے مولانا اور اُن کے خاندان کو بدایوں کی طرف اُتروا دیا۔

مولانا قریب دو سال تک اِدھر اُدھر خانہ بدوشی کی زندگی بتاتے رہے۔ لیکن کچھ ہی دن بعد ملکہ وکٹوریہ کا عام معافی کا اعلان ہوا اس پر مولانا ظاہر ہوگئے اور اپنے گھر خیرآباد میں جاکر رہنے لگے۔

گرفتاری اور سزا۔ لیکن مولانا سرکاری فہرست کے اُن لوگوں میں تھے، جنکو معافی نہیں دی گئی تھی۔ اسلئے کچھ ہی دن بعد مولانا گرفتار کرلئے گئے اور لکھنؤ جاکر اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔

۵

مولانا نے خود ہی اپنی پیروی کی۔ ادھر جج مولانا کا ایک پرانا شاگرد تھا اور مخبر پر بھی کچھ ایسا اثر پڑا کہ شناخت کے وقت اُس نے کہہ دیا کہ فتویٰ دینے والے فضل حق یہ نہیں ہیں۔ ان کو میں نہیں جانتا۔

اس طرح مولانا کے چھوٹنے کی پوری اُمید تھی۔ لیکن مولانا کو یہ جھوٹ گوارا نہ ہوا۔ اُنھوں نے اپنے آخری بیان میں کہا کہ مخبر نے کسی وجہ سے میری شناخت نہیں کی ہے۔ لیکن فتویٰ میں نے ہی دیا تھا اور آج بھی میری وہی رائے ہے۔

جج اور گواہ حیران تھے اور گھر والے پریشان تھے لیکن مولانا نے بات بدلنے سے انکار کر دیا۔ مولانا کو اُمید تھی کہ پھانسی کی سزا ملے گی۔ لیکن جج نے رعایت کی۔ اور کالے پانی کی سزا دی۔ مولانا کی یہ ہمّت دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔

کالے پانی میں — مولانا کالے پانی پہنچا دیے گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے مولوی تھے۔ اُنھوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن مولانا وہاں دن رات تڑپتے رہتے تھے۔ کالے پانی میں لکھی ہوئی ان کی کتاب 'ثورت الہندیہ' آنسوؤں کا ایک بہتا ہوا چشمہ ہے۔ جس میں ایک ایک حرف میں مولانا کی تڑپ موجود ہے۔ یہ کتاب کپڑوں پر کوئلوں سے لکھی گئی اور بڑی مشکل سے ہندستان تک آئی۔ مولانا نے اُس میں اپنی تکلیفوں کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اُسے پڑھ کر آج بھی جھرجھری آنے لگتی ہے۔

ادھر مولانا کی رہائی کی کوشش بھی ہو رہی تھی۔ آخر مولانا کے بیٹے شمس الحق رہائی کا پروانہ لیکر انڈمن روانہ ہوئے اور جہاز سے اتر کر جب شہر میں گئے تو دیکھا کہ ایک جنازہ چلا آرہا ہے جس کے ساتھ بہت بھیڑ ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر سنہ ۱۲۷۸ ہجری یعنی سنہ ۱۸۶۱ عیسوی کو مولانا فضل حق صاحب کا انتقال ہو گیا اور اب دفن کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔
مسافر اپنی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے۔

مولوی احمد شاہ

۱۸۵۷ء کی ہندستان کی آزادی کی لڑائی کی بابت اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لڑائی صرف اُن راجاؤں، نوابوں اور سامنتوں کی بغاوت تھی، جنکی جائدادیں یا بھتّے کمپنی کی سرکار نے ضبط کر لئے تھے۔ اسی لئے عام جنتا کا اس لڑائی میں کوئی حصّہ نہیں تھا۔

کسی حد تک یہ بات ٹھیک بھی ہے، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس سامنت وادی زمانے میں بھی ہندستان میں کچھ ایسے دور اندیش بھگت موجود تھے، جنہوں نے اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا اور عام جنتا کا پورا سہیوگ لینے کی کوشش کی تھی۔ ایسے دور اندیش دیش بھگت نیتاؤں میں ایک خاص نام مولوی احمد شاہ کا ہے۔

مولوی احمد شاہ فیض آباد ضلع کے ایک بڑے زمیندار تھے، لیکن زمینداروں کی عیش پرستی اُن کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اپنے اچھے چال چلن اور راج کاج، مذہبی جانکاری کے لئے وہ علاقہ بھر میں مشہور تھے اور راجاؤں و نوابوں کے محلوں سے لے کر کسانوں کی معمولی جھونپڑیوں تک میں اُن کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔

مولوی احمد شاہ نہ تو صرف مذہبی کتابوں میں ہی ڈوبے رہنے والے مولوی تھے، اور نہ رعایا سے ٹیکس وصول کر کے اُن پر

گل چھرے اڑانے والے زمیندار۔ ملک کی سیاست سے بھی اُن کو گہری دلچسپی تھی اور اُن کو اس بات سے بڑا دُکھ ہوتا تھا کہ انگریزوں کی طاقت ہندستان میں دھیرے دھیرے بڑھتی چلی جارہی ہے اور کچھ اپنے بھائی سوارتھ وش ہوکر اپنے اس مُلک کو غلام بنانے میں انگریزوں کی مدد کر رہے ہیں۔ وہ جب تب اپنے اس خیال کو ظاہر بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن اُس زمانے میں عام جنتا کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور راجاؤں نوابوں کو ایسی باتیں سُننے سے بھی ڈر لگتا تھا۔

لیکن ۱۸۵۶ء میں جب لارڈ ڈلہوزی نے نہایت بے شرمی کے ساتھ اودھ کے علاقے کو کمپنی کے ادھیکار میں لے لیا اور نواب واجد علی شاہ کو قید کرکے کلکتے بھیجدیا گیا تو مولوی احمد شاہ اسے برداشت نہیں کرسکے۔ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ اس طرح ایک ایک کرکے ہر ایک نواب اور راجہ کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ ہوگا اور پورا دیش انگریزوں کے آدھین ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے یہ بھی محسوس کیا کہ آزادی کی لڑائی تب تک کامیاب نہیں ہوسکے گی، جب تک کہ اس دیش کی پوری جنتا اُس میں حصّہ نہ لے۔ اسی لئے نہ تو اُنھوں نے راجاؤں اور نوابوں کی ڈیوڑھیوں کے چکّر لگائے اور نہ ولی اللّٰہی جماعت کے نیتاؤں کی طرح مسلمان جنتا ہی تک اپنے پرچار کو محدود رکھا۔ مولوی احمد شاہ نے ہندو مسلمانوں میں ایک ساتھ دیش کی آزادی کے نام پر انگریزوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کا پرچار شروع کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی کے دوسرے نیتاؤں اور مولوی احمد شاہ

میں یہی خاص فرق ہے، جو اُن کو کہیں زیادہ عزت کا حق دار بنا دیتا ہے۔ کاش، کچھ اور نیتا مولوی احمد شاہ کا ساتھ دیتے، تو شاید ۱۸۵۷ء کی لڑائی اس طرح سے اور اتنی جلدی ناکامیاب نہیں ہوتی۔

مولوی احمد شاہ کے پرچار کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ لکھنؤ سے آگرہ تک کے بیچ برابر دورے کرتے رہتے تھے اور دس دس ہزار آدمیوں کی بھیڑ اُن کی تقریر سُننے کے لیے اکٹھی ہوتی تھی۔ مولوی احمد شاہ اُن کو بتلاتے رہتے تھے کہ انگریز کس طرح اس ملک میں بڑھتے گئے اور اگر پورا ملک اُن کے قبضہ میں چلا گیا تو اس کا نتیجہ عام جنتا کے لیے کیا ہوگا۔ اس طرح یہ تقریریں سو فیصدی سیاسی تقریریں ہوتی تھیں اور مولوی احمد شاہ کی زبان میں کچھ ایسا جادو تھا کہ کئی کئی گھنٹے تک یہ ہزاروں آدمی بُت بنے ہوئے اُن کی تقریریں سنتے رہتے تھے اور ملک کی بے بسی پر آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اُس زمانے میں مولوی احمد شاہ شاید پہلے آدمی تھے جنہوں نے اپنے پرچار کا یہ طریقہ اپنایا تھا۔

اسی زمانے میں مولوی احمد شاہ نے بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھیں جو پڑھے لکھے حلقے میں بڑی تعداد میں بانٹی گئیں۔ ان کتابوں میں بھی وہی بات تھی، جو مولوی صاحب کی تقریروں میں ہوتی تھی۔ اس طرح لاکھوں ہزاروں آدمیوں کے دل میں مولوی احمد شاہ نے دیش بھگتی کا سچا جذبہ پیدا کر دیا۔

اُس زمانے میں انگریزوں کے مخبروں کا جال صرف راجاؤں نوابوں کے راج درباروں اور محلوں تک ہی محدود تھا، اس لیے

مولوی احمد شاہ کا یہ کھلا پرچار بھی کچھ مہینوں تک اُن کی نظر میں نہ آسکا۔ لیکن جب آگ زیادہ بڑھی اور اُس کی لپٹیں انگریزوں کو بھی لگنے لگیں، تو اُنھوں نے مولوی احمد شاہ کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اودھ کی پولیس نے انگریزوں کا یہ حکم ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر فوج بھیجی گئی اور مولوی صاحب گرفتار کرلیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی تُرنت مولوی صاحب کا مقدمہ بھی کرلیا گیا اور اُن کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھانسی کی تاریخ تک کے لیے مولوی صاحب کو فیض آباد جیل میں بند کردیا گیا۔

مولوی احمد شاہ کی گرفتاری اور اُن کی پھانسی کی سزا کی خبر جنتا کو جیسے ہی ملی، ویسے ہی علاقہ بھر میں آگ سی لگ گئی۔ فیض آباد شہر میں اُس وقت ۲۲ پیدل پلٹن، کچھ سوار اور کچھ توپ خانہ تھا، جو اُس وقت تک انگریزوں کا پوری طرح وفادار تھا۔ لیکن مولوی احمد شاہ کی گرفتاری کی خبر پاتے ہی وہ دیش کے وفادار ہوگئے اور مولوی احمد شاہ ہندوؤں کو بھی کتنے پیارے تھے، اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مولوی صاحب کی گرفتاری کے دوران میں سب سے پہلے ہتھیار اُٹھانے والا ایک ہندو صوبے دار دلیپ سنگھ تھا، جس نے فیض آباد کے تمام انگریز افسروں کو قید کرلیا اور فیض آباد کی آزادی کا اعلان کردیا۔

اس کے بعد ہندستانی سپاہیوں اور جنتا کی ایک بڑی بھیڑ جیلخانے پر پہنچی اور اُس نے دیوار توڑ کر مولوی احمد شاہ کو باہر

نکال لیا۔ مولوی صاحب کی بیڑیاں کاٹ ڈالی گئیں اور جنتا و سپاہیوں نے اُن کو اپنا نیتا چُن کر اُن کی ہی ماتحتی میں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح فیض آباد کے علاقے کی باگ ڈور پوری طرح مولوی صاحب کے ہاتھ میں آگئی۔

اُس وقت مولوی صاحب نے جو پہلا کام کیا۔ اُس سے نہ صرف مولوی صاحب کا بلکہ پورے ہندستان کا سر اونچا ہوتا ہے۔ یہ کام تھا انگریز افسروں اور اُن کے بال بچوں کو پوری حفاظت کے ساتھ فیض آباد سے روانہ کرنا۔ یہ انگریز کشتیوں کے ذریعے فیض آباد سے روانہ کئے گئے اور راستے کے لئے اُن کو کافی رسد بھی دے دی گئی۔ جو لوگ پچھمی پنجاب کے ہندوں پر ہونے والے ظلموں کا بدلہ پوربی پنجاب کے مسلمانوں سے لینا جائز بتاتے ہیں اور پوربی پنجاب کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلموں کا بدلہ پچھمی پنجاب کے ہندوں سے لینا ٹھیک سمجھتے ہیں، اُن کو مولوی احمد شاہ کے اِن کارناموں کو آنکھ کھول کر پڑھنا چاہیئے جنھوں نے اُن انگریزوں کی ہی حفاظت کی، جو اُن کو پھانسی کے تختے پر بھیج چکے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ٹھیک یہی برتاؤ مولوی احمد شاہ کے دوسرے ساتھیوں یعنی شاہ گنج کے تعلقدار راجہ مان سنگھ ساونی کے زمیندار سردار رستم شاہ اور کالا کے راجہ ہنومنت سنگھ نے بھی کیا۔ انگریزوں کو فیض آباد سے نکال دینے کے بعد ۹ جون ۱۸۵۷ء کو یہ اعلان کر دیا گیا کہ فیض آباد کے علاقے سے کمپنی کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور اب وہ واجد علی شاہ کی حکومت میں ہے۔ اُن کے ساتھ ہی پورے

علاقے کا ایسا انتظام بھی کر دیا گیا، جس سے گنڈے اور شرارتی لوگ، جو ایسے ہی موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں، سر نہ اُٹھا سکیں۔

اس کے بعد جب لکھنؤ پر انگریزوں نے پھر گھیرا ڈالا، تو مولوی احمد شاہ اپنے ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ لکھنؤ میں جا کر جم گئے۔ لکھنؤ شہر کے بھیتر نومبر ۱۸۵۷ء سے لے کر مارچ ۱۸۵۸ء تک آزادی کی لڑائی برابر چلتی رہی اور مولوی احمد شاہ برابر اس میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۱ر مارچ ۱۸۵۸ء کو جب کیمپبل کی فوج، گورکھوں کی فوج اور پوربی حصے سے آنے والی انگریزی فوجوں نے لکھنؤ پر ایک ساتھ چڑھائی کی تھی اس وقت بھی مولوی احمد شاہ لکھنؤ کے سینا پتیوں میں ایک خاص حیثیت رکھتے تھے۔ فوج کو کمان کرنے کی ان کی قابلیت کتنی بڑھی چڑھی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے انگریز لیکھک ہومس نے لکھا ہے:-

"فیض آباد کے مولوی احمد شاہ ایک ایسا آدمی تھا، جو جذبات اور قابلیت دونوں کے لحاظ سے ایک بڑی تحریک کو چلانے اور ایک بڑی فوج کی کمان سنبھالنے کیلئے سب طرح سے یوگیہ تھا"۔

لیکن ان دنوں ہی دلّی کی طرح لکھنؤ میں بھی ہندستانی نیتاؤں میں آپسی پھوٹ اور جلن پھیلنے لگی تھی۔ بجائے قابلیت کے اونچے خاندان اور اونچی حیثیت کو ترجیح دی جاتی تھی اور ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں فوج کی کمان رہتی تھی۔

یہ آپسی پھوٹ اور جلن اتنی بڑھ گئی تھی، کہ ایک

بار لکھنؤ کی بیگم نے مولوی احمد شاہ کو گرفتار تک کر لیا۔ لیکن جب فوج اور جنتا کی طرف سے ان کا دباؤ ہوا تو مولوی صاحب چھوڑ دیئے گئے۔ اس سے مولوی صاحب کے دل کو دھکا تو لگا پر وہ دیش کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے الگ نہ ہوئے اور برابر لڑائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ جتنی بار ہندستانی سینا نے عالم باغ پر حملہ کیا مولوی احمد شاہ گھوڑے پر یا ہاتھی کے اوپر ہمیشہ سب سے آگے لڑتے ہوئے دیکھے جاتے تھے۔

۱۵ جنوری ۱۸۵۸ء کو مولوی احمد شاہ کے ایک ہاتھ میں گولی لگی۔ قریب ایک مہینہ تک وہ اسی وجہ سے چارپائی پر پڑے رہے۔ لیکن ۱۵ فروری کو وہ پھر میدان میں آ کر جم گئے۔ لیکن اب اپنے لوگوں میں ہی سیکڑوں غدار پیدا ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴ مارچ کو لکھنؤ پوری طرح انگریزوں کے ہاتھوں میں آگیا اور مولوی احمد شاہ، نواب برجیس قدر اور بیگم حضرت محل کے ساتھ شہر سے نکل گئے۔

مولوی احمد شاہ کے دل میں لکھنؤ چھوڑنے کا بڑا رنج تھا۔ اس لئے تھوڑے سے ساتھیوں کو لے کر ایک بار پھر مولوی صاحب لکھنؤ پہنچے، اور سعادت گنج محلے میں اپنا مورچہ جما دیا۔ اس وقت مولوی صاحب کے پاس صرف دو توپیں تھیں، پھر بھی وہ دیر تک انگریزوں کی بہت بڑی فوج کا جم کر مقابلہ کرتے رہے لیکن آخر میں ان کو ہٹنا پڑا۔ انگریزی فوج نے چھ میل تک مولوی صاحب کا پیچھا کیا، لیکن وہ ان کو نہیں پا سکی۔ مولوی صاحب

پھر صاف نکل گئے۔

اس کے بعد مولوی صاحب لکھنؤ کے پچاس میل کے اندر اندر انگریزوں کے خلاف برابر لڑائی چلاتے رہے۔ کچھ دن بعد وہ نانا صاحب کے ساتھ بریلی جا پہنچے۔ کچھ ہی دنوں میں دلّی اور اودھ کے کچھ اور نیتا اور اودھ کی بیگم حضرت محل بھی بریلی جا پہنچیں۔ یہ خبر ملتے ہی سر کالن کیمپبل اپنی فوج کے ساتھ بریلی جا پہنچا۔ نیتاؤں نے فیصلہ کیا کہ بریلی سے نکل کر اور روہیلکھنڈ میں چاروں اور پھیل کر انگریزوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی جائے۔ اسی فیصلہ کے مطابق مولوی صاحب نے بریلی سے نکل کر شاہجہاں پور پر مورچہ جمایا اور کچھ ہی دیر میں اُس پر قبضہ کر لیا۔ کیمپبل پھر اپنی فوج کے ساتھ شاہجہاں پور پہنچا اور ایک بار تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس بار مولوی صاحب انگریزوں کے پھندے سے نہیں بچ سکیں گے۔ لیکن مولوی صاحب کو گھرا ہوا دیکھ کر روہیلکھنڈ کے سبھی کرانتی کاری نیتا، نانا صاحب، بیگم حضرت محل، شہزادہ فیروز شاہ اور راجہ تیج سنگھ وغیرہ اپنی اپنی فوجیں لے کر شاہجہاں پور پہنچ گئے اور مولوی صاحب کو نکال لائے۔ یہ گھٹنا ثابت کرتی ہے کہ مولوی صاحب اُن نیتاؤں کی نظر میں کیا حیثیت رکھتے تھے۔

لیکن گھر کے غدّاروں سے کون بچ سکتا ہے؟ مولوی صاحب دوبارہ اودھ پہنچے اور انگریزوں کے خلاف اپنا سنگٹھن کرنے لگے تو پوّن نام کی ایک چھوٹی سی ریاست کے راجہ جگنناتھ سنگھ نے

مولوی صاحب کو اپنے یہاں بلایا اور جب مولوی صاحب وہاں گئے تو راجہ کے ایک بھائی نے دھوکا دے کر اُن کو گولی مار دی۔ راجہ جگناتھ سنگھ نے فوراً مولوی صاحب کا سر کاٹ کر پاس کے انگریز کیمپ میں پہنچا دیا، جس کے بدلے میں اسکو پچاس ہزار روپے انگریزوں سے انعام میں ملے۔ اس طرح ۵ر جون ۱۸۵۸ء کو آزادی کی لڑائی کا ایک سچا دیش بھگت نیتا ہمارے ہی وشواس گھات کے کارن مارا گیا اور اس کی موت نے دوسرے نیتاؤں کو بھی بالکل پست ہمت کر دیا۔

مولوی احمد شاہ کے بارے میں مشہور اتہاس لیکھک مالیسن نے اپنی کتاب "انڈین میوٹنی" (ہندستان کا غدر) کی پہلی جلد، بھاگ چار، صفحہ ۳۸۱ میں لکھا ہے:

"مولوی بڑا عجیب آدمی تھا × × سپاہی کی حیثیت سے اس کی قابلیت کے غدر میں بہت سے ثبوت ملے × × × × × کوئی بھی دوسرا آدمی گھمنڈ کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے دو مرتبہ سر کالن کیمپبل کو میدان میں ہرایا ہے! × × × × اگر ایک ایسے انسان کو، جس کے دیش کی آزادی بے انصافی کے ساتھ چھین لی گئی ہو، اور جو پھر سے اس کو آزاد کرنے کی کوشش کرے اور اس کے لئے جنگ کرے، دیش بھگت کہا جا سکتا ہے، تو اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ مولوی احمد شاہ سچا دیش بھگت تھا۔ اس نے کسی کی چپ چاپ ہتیا کر کے اپنی تلوار پر کلنک نہیں لگایا نہتّے اور بے قصور لوگوں کی ہتیا کو اس نے کبھی گوارا نہیں کیا اس نے مردانہ وار، اُن کے ساتھ اور ڈٹ کر کھلے میدان میں اُن بدیشیوں

کے ساتھ جنگ کی، جنھوں نے اُس کا دیش چھین لیا تھا۔ ہر دیش کے ویر اور سچّے لوگوں کو مولوی احمد شاہ کا نام عزت کے ساتھ لینا چاہیے۔"

یہ شبد ایک انگریز کے ہیں، جن کے خلاف مولوی صاحب لڑے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتنے اونچے درجہ کے بہادر اور شان دار چال چلن کے انسان تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تواریخ میں لاکھوں شہیدوں کے بیچ اُن کا نام ہمیشہ سورج کی طرح چمکتا رہے گا۔

مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی

ہندستان کے ان سیکڑوں ہزاروں دیش بھگتوں میں، جو دیش کی آزادی کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر ودیش گئے، اور پھر جیتے جی اپنے وطن کو نہ لوٹ سکے، مولانا محمد برکت اللہ صاحب بھوپالی کے نام اور کام کی چرچا ہمیشہ کی جاتی رہے گی اور وطن کی بھلائی کے لئے کام کرنے والے لوگ ہمیشہ اُن کی زندگی کے حالات سے روشنی اور ہمت پاتے رہیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا برکت اللہ صاحب نے جس زمانے میں دیش بھگتی کی راہ میں قدم اُٹھایا، اُس زمانہ میں حالانکہ بہت سے لوگ ملک کی آزادی کے لئے کوشش کر رہے تھے اور اس کے لئے نہایت دلیری کے ساتھ طرح طرح کی تکلیفیں سہہ رہے تھے، لیکن اُن میں سے زیادہ تر لوگوں کی سیاست محض جذباتی تھی۔ "ہندستان ہمارا، ہمارے پرکھوں کا دیش ہے، اس کی تہذیب اور اس کا پرانا اتہاس بہت شان دار ہے، لیکن غلام ہونے کی وجہ سے اس کی پرانی عزت دھول میں مل گئی ہے، اس لئے ہم کو اپنے دیش کو آزاد کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔" اُس وقت اکثر دیش بھگتوں کے خیالات ایسے ہی ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی اُن میں تھی کہ چونکہ اُن کی دیش بھگتی اپنے پچھلے شاندار زمانے کی یاد اور اُسے پھر سے حاصل کرنے کی خواہش پر قائم تھی، اس لئے اگر مسلمان

دیش بھکت مغلوں جیسا راج چاہتے تھے، تو ہندو دیش بھکت راجپوتوں جیسا یا مرہٹوں جیسا۔ ان دونوں میں حالانکہ کوئی آپسی من مٹاؤ نہیں تھا اور نہ ان دونوں میں فرقہ پرستی ہی تھی، پھر بھی اپنے ان خیالات کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے نزدیک نہ آسکے یہی وجہ ہے کہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۵ء تک ہم ہندستان کے ہندو اور مسلمان انقلابیوں کو صاف صاف الگ الگ صفوں میں پاتے ہیں۔ اُس وقت دیو بند کا مدرسہ اگر مسلمان انقلابیوں کا گڑھ تھا، تو مہاراشٹر اور بنگال ہندو انقلابیوں کے گڑھ تھے۔ لیکن نہ تو مہاراشٹر اور بنگال کے ہندو انقلابیوں میں کسی مسلمان کا نام پایا جاتا ہے اور نہ مدرسہ دیو بند کے کرانتی کاریوں میں کسی ہندو کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُس وقت جمہوریت یعنی پنچایتی راج کی بات ان لوگوں کے دماغ میں نہیں تھی۔ لہذا دونوں نے کبھی ایک ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ حالاں کہ جب کبھی موقع آیا، تب ان دیش بھکتوں نے ہندو مسلم ایکتا کی پوری کوشش کی۔ مثال کے سلئے حاجی رشید احمد صاحب گنگوہی کا وہ فتویٰ اس سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے، جو اُنھوں نے ۱۹۰۵ء میں دیا تھا اور جس میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ کانگریس میں شامل ہوں، جو ہندو مسلمانوں کی ملی جلی جماعت ہے۔ لیکن سرسیدؔ کی 'مسلم انجمن' میں، جو صرف مسلمانوں کی جماعت ہے، شریک نہ ہوں۔

لیکن اسی زمانے میں مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی نے

اس میدان میں آکر اس بڑی کمی کو پورا کر دیا۔ مولانا بھوپال کے رہنے والے تھے اور آپ کے پتا ریاست کے ایک بڑے سرکاری افسر تھے۔ اُنھوں نے اپنے لڑکے کو اونچی سے اونچی تعلیم پانے کے لئے ولایت بھیجا۔ اس طرح مولوی برکت اللہ صاحب بھری جوانی میں ولایت پہنچے۔ لیکن وہ ولایت پہنچ کر دوسرے ہندستانی ودیارتھیوں کی طرح راس رنگ میں نہیں ڈوب گئے، بلکہ انگلینڈ پہنچتے ہی اُن کے دل میں یہ سوال اُٹھا کہ انگلینڈ جیسا چھوٹا ملک اتنا خوش حال کیوں ہے اور میرا دیش ہندستان اتنا وشال ہوتا ہوا اتنا غریب کیوں ہے۔ اُنھوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندستان کی دل کو کنپا دینے والی یہ غریبی صرف اس لئے ہے کہ ہندستان پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ انگریزی حکومت جونک کی طرح ہندستان کا خون پی رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریز قوم اور اُن کا ملک موٹا اور مضبوط ہوتا جا رہا ہے جبکہ ہمارا دیش دنوں دن کمزور اور بیمار پڑتا جا رہا ہے۔

اُس زمانے میں مہاراشٹر کے مشہور نیتا شری گوپال کرشن گوکھلے کا بڑا زور تھا۔ "ہندستان کی مالی حالت کیسے بگڑی؟" اس مضمون پر اُن کے بڑے زور دار جانکاری سے بھرے ہوئے لکچر ہوتے تھے، اس لئے شروع شروع میں مولانا برکت اللہ صاحب پر اُن کا بہت اثر پڑا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ اُن کی نرم نیتی سے اوب گئے اور اُن کا جھکاؤ تلک پارٹی کی طرف ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا ہندستان آگئے اور اُنھوں نے بھوپال سے ایک اخبار

نکالنا شروع کردیا۔ اُس زمانے میں جب کہ ولایت ہو آنا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی اور ولایت کے پاس لوگوں کو بڑی سے بڑی نوکریاں ملنا بے حد آسان تھا، مولانا نے اس طرف نہ جاکر اپنے ملک کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی دیش بھگتی محض دکھاوٹی نہیں تھی۔ اُن کے دل میں سچ مچ اپنے ملک کے لئے بھاری درد تھا اور وہ اُس کے لئے بھاری سے بھاری قربانی کرنے میں بھی آگا پیچھا نہیں سوچتے تھے۔

مولانا کا یہ اخبار کچھ دنوں تک چلا، لیکن اُس کے گرم وچاروں کو زیادہ دن تک سرکار برداشت نہیں کرسکی۔ اخبار بند کردیا گیا اور مولانا پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ مولانا سمجھ گئے کہ اب وہ دیش میں رہ کر اپنے خیالات کا پرچار نہیں کرسکیں گے۔ اس لئے وہ جاپان پہنچے اور وہاں کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگئے۔ یہیں سے انھوں نے 'اسلامک فریٹرنیٹی' کے نام سے ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔

یہ اخبار سرسید کی اُن ہلچلوں کی مخالفت کرتا تھا، جن سے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا برکت اللہ صاحب کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی بھلائی صرف اسی میں ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریز حکومت سے مورچہ لیں۔

اس اخبار کی وجہ سے جب انگریز حکومت نے اپنے کام میں بادھا پڑتے دیکھی، تو اُس نے جاپان سرکار پر اس کے خلاف

کارروائی کرنے کے لئے زور ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی حکومت نے اس اخبار کو بند کر دیا۔ اخبار کے بند ہوتے ہی مولانا نے بھی اپنا بوریا بستر سنبھالا اور جاپان سے چل دیئے۔ جس یونیورسٹی میں مولانا پروفیسر تھے، اس کے منتظم نہیں چاہتے تھے کہ مولانا یونیورسٹی کو چھوڑ جائیں، لیکن مولانا نے لڑکے پڑھانے اور پیٹ پالنے کے لئے اپنا وطن نہیں چھوڑا تھا۔ وہ جاپان سے سیدھے امریکہ پہنچے اور وہیں اپنا پرانا کام شروع کر دیا۔ لیکن ان کو یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ ان کے ملک کے مسلمان کچھ بوار تھی نیتاؤں کے بہکانے میں آکر آج اس بات پر بحث کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ کانگریس میں ملنا چاہیئے یا نہیں۔ حالانکہ اس وقت کانگریس کی جو نرم پالیسی تھی، اس کی وجہ سے مولانا کانگریس کو بھی کچھ زیادہ کام کی چیز نہیں سمجھتے تھے، لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ دیش کا ایک ملا جلا پلیٹ فارم ہے، جس کا اثر حکومت پر بھی کچھ نہ کچھ پڑتا ہی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے ۲۱ فروری ۱۹۰۵ء کو ایک خط مولانا حسرت موہانی صاحب کو لکھا تھا۔ یہ خط مولانا کی اس وقت کی وچار دھارا کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے، اس لئے اس کا کچھ حصہ یہاں دیا جاتا ہے۔ خط فارسی میں تھا جس میں مولانا نے لکھا تھا:-

"حال ہی میں آپ نے ہندو مسلم ایکتا پر جو ایڈیٹوریل لکھا ہے اور انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ جلسے میں مسلمانوں کے شامل ہونے کے بارے

میں لکھنے کی جو مہربانی کی ہے، اُس کا انگریزی ترجمہ میں نے دیکھا بیحد خوشی ہوئی۔
سب سے پہلی بات، جو ہندو مسلم ایکتا کے لئے دلیل بن سکتی ہے،
دیش پریم اور ہم جنس (دونوں کا ہندستانی ہونا) ہے۔ اصلیت تو یہ ہے
کہ زیادہ تر مسلمانوں کے پرکھے ہندو تھے اور ہندستانی تھے۔ اس
لئے کچھ مذہبی مت بھید اُن کی اصلی ایکتا کو ختم نہیں کر سکتے۔
اس کے علاوہ ہندو مسلم ایکتا کی سب سے بڑی ضرورت اس لئے بھی
ہے کہ اس وقت دیش میں عام تباہی پھیلی ہوئی ہے۔

پچھلے دس برسوں میں قریب دو کروڑ انسان بھوکھ سے مر چکے ہیں۔
اور ان غریبی کے مارے ہوئے لوگوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان
بھی۔ اس حادثے (درگھٹنا) کی بھینکرتا تب سمجھ میں آتی ہے، جب ہم
اس تعداد کا مقابلہ ایران کی آبادی سے کریں، جو صرف ڈیڑھ کروڑ ہے۔

آخر یہ غریبی کہاں سے آئی؟

(۱) جس وقت سے برٹش حکومت قائم ہوئی، انگریزی کارخانوں
کے مالکوں نے مشینوں کے ذریعے کپڑا، ہتھیار، برتن وغیرہ بنا کر
ہندستان کی تمام کاریگری کو دھول میں ملا دیا۔ ۱۸ ویں
صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے شروع میں انگلینڈ کی
پارلیامنٹ نے یہ قانون بنایا کہ ہندستان کی بنی ہوئی چیزیں
جب انگلینڈ آویں گی، تو اُن پر کسٹم ڈیوٹی قریب ستر یا
اسّی فی صدی لگے گی اور انگلینڈ کی بنی ہوئی چیزوں پر جو
ہندستان پہنچیں گی، یا تو کسٹم ڈیوٹی لگائی ہی نہ جائے اور اگر
لگائی بھی جائے، تو بہت کم اور ہندستان کی حکومت کا

خرچ چلانے کے خیال سے لگائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کی کاریگری دوسرے ملکوں میں گاہک نہیں پا سکی اور اپنے ہندستان میں انگلینڈ کی چیزیں سستی ہونے کی وجہ سے خوب بکنے لگیں۔ اسی لئے دھیرے دھیرے ہندستان کی تمام کاریگری جڑ سے ختم ہو گئی اور ہندستان، جو اپنے پرانے زمانے سے کلا کوشل کا گھر سمجھا جاتا تھا، صرف ایک کھیتی باڑی کا ملک بن کر رہ گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندستان کی تمام اُپج اور یہاں تیار ہونے والی چیزوں کو انگریز پونجی پتی بہت سستا خرید کر دوسرے ملکوں میں مہنگا بیچتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں کھیتی نئے طریقوں سے نہیں ہوتی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہندستان کی حکومت قریب تیس کروڑ روپیہ ہندستان کی وزارت پر خرچ کرنے کے لیے، انگلینڈ کے پونجی پتیوں سے لئے ہوئے قرض کا سود چکانے کے لئے اور پرانے انگریز نوکروں کی پنشن دینے کے لئے ہر سال ولایت بھیج دیتی ہے۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ سب بڑے بڑے عہدے صرف انگریزوں کو دیئے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی نوکریاں ہی ہندستانیوں کو ملتی ہیں۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ قانون اور انڈین سول سروس کے امتحان دینے کے لئے ہندستانیوں کو انگلینڈ جانے کے واسطے مجبور کر دیا گیا ہے۔

یہ تھوڑے سے نقصان ہیں، جو ہماری بربادی کے اصلی کارن ہیں اور جن سے پورے ہندستان کی بربادی ہو رہی ہے۔ یہ نقصان میں نے بہت مختصر، یعنی کسی بڑے ڈھیر میں ایک مٹھی کی طرح اس لئے بیان کئے ہیں، جس سے اُن لوگوں کو، جو کانگریس سے دور رہنا چاہتے ہیں، نصیحت حاصل ہو۔

اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر اس کش مکش کے میدان میں ناموری کی گیند اپنے ہندو بھائیوں سے آگے نکال لے جائیں تو وہ اسلام کی بہت بڑی خدمت کریں گے۔"

یہ خط بتاتا ہے کہ مولانا برکت اللہ صاحب کی سیاست صرف جذباتی نہیں تھی، بلکہ اپنے کروڑوں لاکھوں دیش بھائیوں کی تکلیفیں اور غریبی ہی اُن کو اس میدان میں کھینچ لائی تھی۔

اس کے بعد ۱۹۱۰-۱۱ء میں جب امریکہ میں غدر پارٹی کا سنگٹھن ہوا، تو مولانا اُس میں شامل ہو گئے۔ یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ غدر پارٹی کے تمام نیتا سکھ تھے، لیکن مولانا کو اُس میں شامل ہونا ضروری معلوم ہوا، کیوں کہ اُن کے نزدیک دیش بھگتوں کی ایک الگ قوم تھی، جس میں ہندو، مسلمان، سکھ وغیرہ کا کوئی بھید ہی نہیں تھا۔ غدر پارٹی کے سکھ بھائیوں نے بھی اُن کو سرآنکھوں پر بٹھایا اور آگے چل کر جب جب غدر پارٹی کے نیتاؤں میں پھوٹ پڑی، تب تب مولانا ہی ایک اکیلے ایسے آدمی رہے، جن پر غدر پارٹی کا ہر ایک ممبر لیڈر کی طرح یقین رکھتا تھا اور اُن کی بات مان لیتا تھا۔

۱۹۱۴ء میں جب یورپ میں بڑی لڑائی شروع ہوئی تو مولانا فوراً جرمنی پہنچے اور وہاں سے جو انڈو جرمن ترکش مشن افغانستان کے لئے چلا، اُس کے ایک ممبر بن کر ترکی ہوتے ہوئے افغانستان آگئے۔ یہ مشن اس لئے آیا تھا، جس سے کہ افغانستان کی سرکار کو اپنی طرف ملاکر ہندستان پر حملہ کردیا جائے۔ یہیں پر مولانا برکت اللہ صاحب کی جان پہچان مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اور مولانا محمد میاں صاحب کے ساتھ ہوئی اور وہ ہندستان کی اُس عارضی آزاد حکومت میں شامل ہوگئے، جو اُن لوگوں نے بنائی تھی۔ اس سرکار میں مولانا برکت اللہ صاحب کی حیثیت سب سے بڑے وزیر کی تھی۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ حکومت افغانستان کی انگریز پرست پالیسی کی وجہ سے کچھ زیادہ کام نہ کرسکی، اس لئے لڑائی ختم ہونے پر مولانا روس چلے گئے۔ وہاں آپ نے روس کی حکومت اور کمیونزم کی بابت پورے حالات سمجھے اور پڑھے، جس سے آپ کو ایک نئی روشنی ملی۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی تھیں، جن سے آپ روس کے نظریے سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اس لئے آپ روس سے لوٹ کر جرمنی آگئے اور وہاں سے "الاصلاح" نام کا ایک اخبار نکالنے لگے۔ اس اخبار کا منشا بھی ہندستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے مقابلے میں کھڑا کردینا تھا۔ یہ اخبار کچھ دنوں تک چلا، لیکن روپئے پیسے کی تنگی کی وجہ سے آخر مولانا کو اسے بند کردینا پڑا۔

فروری ۱۹۲۷ء میں جب بروسیلس میں اینٹی امپیریلزم

کانفرنس ہوئی تو آپ نے اُس میں غدر پارٹی کے سرکاری نمائندے کی حیثیت سے حصّہ لیا۔ اس کانفرنس میں تمام دنیا کے نمائندے آئے تھے اور ہندستان کی کانگریس کی طرف سے اُس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے حصّہ لیا تھا۔ اُسی وقت آپ کی ملاقات نہرو جی سے بھی ہوئی تھی جن کا ذکر نہرو جی نے اپنی مشہور کتاب 'میری کہانی' میں اچھے لفظوں میں کیا ہے۔

اس کانفرنس کے بعد ہی سان فرانسسکو میں غدر پارٹی کا سالانہ اجلاس ہوا، جس میں آپ کو بہت اصرار کے ساتھ بلایا گیا۔ اُس وقت آپ کی صحت ایسی نہیں تھی کہ آپ اتنی دور کی یاترا کر سکیں۔ پھر بھی آپ انکار نہ کر سکے اور وہاں پہنچے۔ اس اجلاس میں ہونے والی تقریر ہی آپ کی سب سے آخری تقریر تھی، جس میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے برٹش حکومت کے خلاف برابر لوہا لیتے رہنے کی اپیل کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تقریر مولانا کی سب سے اچھی اور سب سے زیادہ کامیاب تقریر تھی، جس کے ایک ایک لفظ میں غضب کا جوش اور درد تھا۔ بہت سے لوگ تو اس تقریر کو سُن کر رونے لگے تھے۔

غدر پارٹی کے اجلاس کے بعد ہی آپ بیمار پڑ گئے۔ اُس وقت آپ کی عمر پینسٹھ برس کی تھی، جس کے قریب ۲۲ برس آپ نے جلاوطنی کی حالت میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں بھاگتے دوڑتے بتائے تھے۔ اُس زمانے میں اُن کو جس حالت میں رہنا پڑا، اُس کی کہانی آج بھی پتھر سے پتھر

دل کو پگھلا سکتی ہے۔ پاس میں پیسہ نہیں۔ رہنے کو ٹھکانا نہیں، بالکل بیگانہ ملک۔ انگریزی حکومت کے جاسوسوں کا گھیرا اور ساتھیوں میں بھی آپسی پھوٹ۔ بھلا اس حالت میں کس کی ہمت قائم رہ سکتی ہے۔ لیکن مولانا جسے بھی ملے اور جب بھی ملے ہنستے ہوئے ہی ملے۔ جب اُن کے اور ساتھی اِن مصیبتوں اور پریشانیوں کی کڑواہٹ کی وجہ سے آپس میں لڑتے تھے، اور ایک دوسرے پر بڑے سے بڑے الزام لگانے لگتے تھے، تب اُن کو سمجھانا اور دھیرج بندھانا مولانا ہی کا کام تھا۔ وہ کبھی اپنی مصیبتوں کی بات زبان پر بھی نہیں لاتے تھے اور اپنے ہر ایک ساتھی کی مصیبت سننے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر ایک حلقے میں وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

کچھ لوگ اُن کو پچھڑے ہوئے خیالوں کا سمجھتے تھے۔ کیوں کہ اُن کی ہر بات کچھ روحانیت کا رنگ لئے ہوئے ہوتی تھی۔ باوجود اِس کے کہ وہ تمام یورپ گھوم آئے تھے اور روس میں بھی کافی دنوں تک رہے تھے، خدا اور مذہب پر اُن کا وشواس دنوں دن پکا ہوتا گیا۔ شاید ہی کبھی اُنھوں نے ایک وقت بھی نماز چھوڑی ہو اور شاید ہی کسی رمضان میں ایک دن بھی بنا روزہ رکھے رہے ہوں۔ پھر بھی اور شاید اسی لئے وہ ہندو مسلمانوں کی ایکتا پر دل سے یقین رکھتے تھے اور اُن کو آپسی پھوٹ سے اتنی نفرت اور چڑھ تھی کہ صرف اس بارے میں وہ کسی کو بھی کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔

اپنی اُس آخری بیماری کے وقت بھی اُن کی غریبی کی حالت یہ تھی کہ اُن کا بستر ایک چھوٹی سی کوٹھری میں تھا، جس میں فرنیچر کے نام پر ایک میز تک نہیں تھی اور دوا یا ڈاکٹر کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ اس حالت میں ہمارے دیش کی آزادی کی لڑائی کا یہ سورما اپنی آخری راتیں گذار رہا تھا لیکن پھر بھی اُن کے چہرے کی مُسکراہٹ چھینی نہیں جا سکتی اور ستمبر ۱۹۲۷ کے اُس دن جب اُنھوں نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں، تب بھی اُن کے چہرے پر وہی مُسکراہٹ بنی رہی۔

مرتے وقت اُنھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا: "تمام زندگی میں ایمانداری کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کے لئے کوشش کرتا رہا۔ میری یہ زبردست خوش قسمتی تھی کہ میری یہ ناچیز زندگی میرے وطن کے کام آئی۔ آج اس زندگی سے بدا لیتے سمے جہاں مجھے یہ افسوس ہے کہ میں اپنی کوششوں میں ناکامیاب رہا، وہاں مجھے اس بات کی بھی تسلّی ہے کہ میرے بعد میرے ملک کی مدد کرنے کے لئے آج لاکھوں آدمی آگے بڑھ رہے ہیں۔ جو سچّے ہیں، بہادر ہیں، جان باز ہیں۔ میں اطمینان کے ساتھ اپنے ملک کی قسمت اُن کے ہاتھوں میں سونپ کر جا رہا ہوں۔"

یہ اُس شہید کے آخری لفظ تھے جو اس دُنیا نے سُنے اس کے بعد تو صرف اُن کی یاد ہی باقی رہ گئی۔

مولانا محمد برکت اللہ کی زندگی کے یہ تمام حالات معلوم ہونے پر کبھی کبھی دل میں خیال ہوتا ہے کہ کاش وہ آج بھی ہوتے اور آزاد

ہندستان میں کچھ ہی دن بتا لیتے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اُن کا آج نہ ہونا بھی اچھا ہی ہے۔ کیوں کہ اگر وہ آج ہوتے، تو یا تو پاکستان کے کسی جیل میں ہوتے کیوں کہ وہ ہندو مسلم ایکتا کے حامی تھے اور یہ بربادی اور آپس کی نفرت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ ہندستان میں رہتے تو اُن کے اسی ملک کے بچے اُن کے ہندستان میں رہنے پر اعتراض کرتے اور اُن کی وفاداری پر کوئی ایسے صاحب شک کرتے نظر آتے، جن کی پوری عمر برٹش حکومت کے تلوے سہلانے میں بیتی ہوتی۔ اس لئے یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ آج ایسی جگہ ہیں، جہاں اُن سے وفاداری کا حلف اُٹھانے کے لئے کہہ کر ہم اُنکا اپمان نہیں کر سکتے۔ ہائے رے بدقسمت ہندستان۔

مولانا مظہر الحق

ہمارے دیش میں آج فرقہ پرستی کا زہر اتنی بری طرح پھیل گیا ہی کہ آج زیادہ تر ہندو ہر ایک مسلمان کو شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور زیادہ تر مسلمان ہر ایک ہندو کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں. جن لوگوں کی پوری زندگی ہماری جانکاری میں ہی دیش سیوا میں بیتی ہی اور جن کو ہم نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف آواز اُٹھاتے اور اُس کے عوض میں اپنی ہی جاتی بھائیوں کے پتھر کھاتے دیکھا ہی، ہمارے دل کی شیطانیت آج ہمیں اُن کے اوپر بھی یقین نہ کرنے اور اُن کو اپنا دشمن ماننے کے لئے بھڑکاتی ہی. یہی کارن ہی کہ آج بھی نہ جانے کتنے مسلمان چھپے چھپے اور گپ چپ پنڈت جواہر لال نہرو پر بھی شک کرنے سے نہیں چوکتے اور ہندو تو کھلم کھلا مولانا آزاد رفیع احمد قدوائی اور شیخ عبداللہ تک کے بارے میں اسی طرح کی زہریلی باتیں کہتے دیکھے جاتے ہیں. ایسی حالت میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہی کہ ہم اپنے ان بزرگوں کی یاد کریں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی ہی دیش سیوا اور آپسی میل ملاپ قائم کرنے میں لگا دی.

ایسے لوگوں میں ایک خاص نام مولانا مظہر الحق صاحب کا ہی، جو بہار کے ایک بہت بڑے رئیس گھرانے میں پیدا ہو کر بھی اپنی دیش بھگتی کے کارن سب کچھ تیاگ کر فقیروں کی طرح رہنے لگے.

تھے۔ جو فرقہ پرست ہندو آج یہ پرچار کرتے پھرتے ہیں کہ ہندستان کا کوئی مسلمان کبھی سچا دیش بھگت نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اپنے [illegible] بھائیوں کے بارے میں اپنا پکش پات ہی چھوڑ سکتا ہے، اُن کے لئے مولانا مظہر الحق صاحب کی زندگی ایک ایسا بھرپور اور سچا جواب ہے جس سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا مظہر الحق صاحب لندن میں گاندھی جی کے ساتھ پڑھتے تھے اور وہیں سے بیرسٹری پاس کرنے کے بعد وہ جیسے ہی دیش لوٹے دیش کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کانگریس دھیرے دھیرے طاقت ور ہوتی جا رہی تھی اور اس نے برٹش حکومت اور اس کے انصاف کی سراہنا کرنے کے بجائے کچھ دبی دبی زبان سے سوراج اور آزادی کی بات کرنی شروع کر دی تھی۔ ہمارے دیش کے انگریز افسر کانگریس کے اس بدلتے ہوئے رویّے کو دیکھ کر بہت ڈرنے لگے تھے اور بہت سوچ بچار کرنے کے بعد انھوں نے کانگریس کی طاقت کو کم کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا اُپائے کھوج نکالا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں میں پہلے تو یہ خیال پیدا کیا جائے کہ وہ ہندستان میں ہندوؤں کے مقابلے میں کم تعداد میں ہیں اور اس لئے ان کو ہندوؤں کے حملوں سے بچنے کیلئے کچھ خاص رعایتوں کی ضرورت ہے اور اس کے بعد اُن کو یہ رعایتیں کچھ ایسے ڈھنگ سے دی جائیں جس سے ہندو اُن رعایتوں کا ورودھ کریں۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال یقین میں بدل جائے کہ سچ مچ ہندو ہمارے دشمن ہیں اور وہ ہماری بڑھتی کو سہن نہیں کر سکتے۔

اس کے لئے سنہ ۱۹۰۹ میں منٹو مارلے ریفارم کے نام سے ایک اسکیم ہندستان پر لاگو کی گئی، جو ہندستان کی مانگوں کا ایک کھجلاہٹ بھرا جواب تھا۔ اس منٹو مارلے ریفارم میں مسلمانوں کی بڑی طرفداری ظاہر کی گئی تھی، لیکن وہ طرفداری اس شکل میں نہیں تھی کہ غریب مسلمان بچوں کے لئے سستی تعلیم کا کوئی انتظام کیا گیا ہو، یا اُنکے لئے اسپتال کھولے گئے ہوں، یا سرحد پر، جہاں کہ سو فیصدی مسلمان رہتے تھے، انگریزی حکومت کے وحشیانہ حملے بند ہو گئے ہوں، بلکہ وہ طرفداری اس شکل میں تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے چناؤ میں ووٹ دینے کا حق پانے کے لئے ایک ہندو کے لئے تو یہ ضروری تھا کہ یا تو اس کی آمدنی تین لاکھ روپیہ سالانہ ہو اور یا وہ کم سے کم تیس سال پرانا گریجویٹ ہو۔ لیکن مسلمان کے لئے صرف تیس ہزار کی آمدنی اور تین سال پرانا گریجویٹ ہونا ہی کافی تھا۔ دنیا بھر میں یہ شاید پہلا موقع تھا، جب کہ ووٹ دینے کے حق کے معاملے میں جاتی یا فرقے کے نام پر اس طرح فرق کیا گیا تھا۔

جیسے ہی یہ اسکیم شائع ہوئی، پورے ہندستان میں اس مسئلے پر ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے اس زمانے کی عام جنتا نہ تو آج کی طرح مہذب ہی تھی اور نہ اسکا سیاست کسے اتنا سیدھا تعلق ہی تھا، اس لئے چھرے بازی تو نہیں ہوئی، پر اخباروں میں کالم پر کالم رنگے گئے۔ بڑی بڑی سبھائیں اس کی مخالفت اور موافقت میں کی گئیں اور اس نے ہندو مسلمانوں کے سوال کو کافی اُبھار دیا۔ ہندو کہتے تھے

کہ ووٹ دینے کے حق کے بارے میں اس طرح بھید بھاؤ کرنا ہمارے ساتھ سراسر ظلم کرنا ہے اور مسلمان کہتے تھے کہ جب انگریز یہ مانتے ہیں کہ کم گنتی میں ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ یہ رعایت کرنا ضروری ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ ہمارا سچا حق ہے اور کانگریس و دوسرے ہندو نیتا اپنی فرقہ پرستی کی وجہ سے ہی اس اسکیم کا ورودھ کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی مسلمان نیتا کا اس اسکیم کی مخالفت میں بولنا کتنی بڑی ہمت کی بات تھی، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن مولانا مظہر الحق صاحب نے اس اسکیم کا جم کر ورودھ کیا اور انھوں نے اُن مسلمان فرقہ پرست نیتاؤں کو جو انگریزوں کی اس بھیانک چال کو اپنی کامیابی سمجھ کر خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے بہت صاف صاف لفظوں میں یہ چیتاونی دی کہ اس اسکیم کو منظور کر کے وہ پھوٹ کا ایسا بیج بوئے دے رہے ہیں، جس کا درخت آگے چل کر بہت کڑوے پھل دے گا۔ جیسا کہ فرقہ پرست گروہوں کا قاعدہ ہوتا ہے اس موقعہ پر مظہر الحق صاحب کو کافی گالیاں اُن کی طرف سے سنائی گئیں، لیکن وہ ان باتوں سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ کاش! اُس وقت ہی اپنے اس دور اندیش نیتا کی آواز پر اس بد قسمت ملک نے دھیان دیا ہوتا۔

اس کے بعد کانگریس کی مانگوں کو انگلینڈ کی جنتا کے سامنے رکھنے کے لئے سنہ ۱۹۱۴ میں جب ایک ڈیپوٹیشن انگلینڈ بھیجا گیا تو اُس میں مولانا مظہر الحق صاحب بھی تھے۔ اس ڈیپوٹیشن میں شری سچدانند سنہا، بھوپیندر ناتھ باسو، مسٹر جناح، لالہ لاجپت رائے

وغیرہ اُن کے ساتھی تھے اور وہاں پر اُنھوں نے جس محنت کے ساتھ اپنے کام کو نباہا، اُس کی سبھی لوگوں نے داد دی. لیکن وہ جلدی ہی سمجھ گئے کہ اس طرح کے ڈیپوٹیشنوں سے کبھی کوئی عملی فائدہ نہیں ہو سکتا. اُس کے بعد اس زمانہ کی لبرل سیاست سے اُنکی طبیعت اوب سی گئی اور وہ کچھ زیادہ کارگر پروگرام پر زور دینے لگے۔

کچھ دنوں بعد سنہ ۱۹۱۶ میں جب مہاتما گاندھی چمپارن گئے نلہے گوروں کے اتیا چاروں کی جانچ کرنے کے لئے بہار پہنچے تو مولانا مظہر الحق صاحب سے اُن کو کافی مدد ملی اُس زمانے میں گاندھی جی کو مدد دینا تو دور اُن کو اپنے گھر میں ٹھہرانا بھی بڑی ہمت کی بات سمجھی جاتی تھی، لیکن مظہر الحق صاحب جس کام کو ٹھیک سمجھتے تھے اُس کے کرنے میں پھر مصیبتوں اور پریشانیوں کا سوال اُنکو اپنے راستے سے کبھی ایک انچ بھی نہیں ڈگا سکتا تھا. اس لئے جب چمپارن میں کام کرتے ہوئے ایک بار گاندھی جی نے اپنے ساتھیوں سے یہ پوچھا کہ اگر اس سلسلے میں جیل جانے کی ضرورت ہوئی، تو کون کون اس کے لئے تیار رہے. تب مولانا مظہر الحق پہلے آدمی تھے ۔ جنھوں نے جیل جانے والوں میں اپنا نام دیا تھا. اس زمانے میں جیل جانا ایک ایسی غیر معمولی بات سمجھی جاتی تھی کہ جب گاندھی جی نے یہ سوال لوگوں کے سامنے رکھا، تو سبھی اُن کے چہرے کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے. لیکن مولانا نے جب اپنا نام پیش کیا، تو اور بھی بہت سے لوگوں نے اپنا نام لکھا دیا. اس لئے گاندھی جی نے جیل جانے والوں کی پہلی

ٹی کا صدر مولانا کو ہی چنا تھا۔

اس کے کچھ دن بعد ہی یعنی سنہ ۱۹۱۷ء میں بہار کے شاہ آباد ضلعے میں اور اس کے بعد گیا اور پلاموضلعوں میں بھی گائے کی قربانی کے مسئلے پر بہت بڑے بڑے ہندو مسلم دنگے ہوئے۔ ان ضلعوں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے جیسا کہ راجیندر بابو نے اپنی "آتم کتھا" میں لکھا ہے، مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں جان اور مال کو بہت بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس وقت مولانا مظہر الحق صاحب کی حیثیت کا کوئی دوسرا لیڈر ہوتا، تو یقیناً اس کی طبیعت پر ان واقعات کا اثر پڑتا اور اس کے دل میں ہندوؤں کی طرف سے کڑواہٹ پیدا ہو جاتی لیکن مولانا جانتے تھے کہ اس بدقسمت ملک میں اس طرح کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی اصلی وجہ دوسری ہی ہے، اس لئے اُنھوں نے اگر مصیبت زدہ مسلمانوں کی مدد کی، تو جو ہندو بلوے کے بعد پولیس اور فوج کی زیادتیوں کے شکار ہوئے، اُنکی مدد کے لئے بھی مولانا کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ انسان انسان میں بھید کرنا اُنکو کبھی نہیں سہاتا تھا اور اسے وہ بہت ذلیل بات سمجھتے تھے۔

اس کے بعد اسہیوگ اندولن شروع ہوا۔ گاندھی جی نے وکیلوں سے، سرکاری نوکروں سے اور ودیارتھیوں سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے کے لئے کہا اور اس پکار کو سنتے ہی مولانا مظہر الحق صاحب اپنا سب کچھ تیاگ کر آزادی کی لڑائی کے میدان میں آڈٹے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے جو تیاگ کیا، اُس کی کہانی آج بھی دل میں ایک اُمنگ

پیدا کر دیتی ہی۔

راجیندر بابو نے اپنی 'آتم کتھا' میں لکھا ہی کہ جب ایک دن انجینیرنگ اسکول کے کچھ وِدّیارتھی وہاں کے پرنسپل سے جھگڑ کر اسکول سے نکل آئے، تو وہ ایک جلوس کی شکل میں مولانا کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ ہم لوگوں نے اسکول تو چھوڑ دیا ہی، اسلئے اب آپ ہم کو کوئی جگہ دیجئے۔ اُس وقت مولانا بہت ہی عیش و آرام کے ساتھ ایک بڑی کوٹھی میں رہا کرتے تھے اور اپنے لئے ایک دوسری کوٹھی بھی بنوا رہے تھے، لیکن جب ان پھول سے نوجوانوں کو جگہ کی تلاش میں اس طرح بھٹکتے دیکھا، تو ان سب لڑکوں کو لے کر اپنی جان پہچان کے ایک صاحب کے چھوٹے سے بنگلے میں آکر رہنے لگے، جو گنگا کے کنارے پر بنا ہوا تھا۔ اُن دنوں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور گنگا کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے وہ جگہ اور بھی زیادہ ٹھنڈی تھی۔ اس کے علاوہ گھنے باغیچوں سے گھرے رہنے کے کارن وہاں سیل بھی تھی۔ لیکن مولانا وہیں جمے رہے۔ کچھ دنوں بعد مولانا نے اپنے ہی پیسے سے وہیں کچھ مکان بھی بنوا دئے اور اُس جگہ کا نام 'صداقت آشرم' رکھ دیا، جو تب سے لیکر آجتک صوبہ کانگریس کمیٹی کا صدر دفتر بنا ہوا ہی۔ اس آشرم میں مولانا نے چرخہ بنانے کا ایک کارخانہ بھی کھولا اور سبھی لڑکوں کو اس کام میں لگا دیا۔ وہ خود لڑکوں کو پڑھاتے بھی تھے اور وہی سادا کھانا کھاتے تھے، جو لڑکے کھاتے تھے۔ لڑکے زیادہ تر ہندو تھے لیکن مولانا کو وہ پتا کی طرح پوجیہ مانتے تھے اور اُن پر بھروسہ کرتے تھے۔ مولانا صاحب نے بھی

اُن کے اس بھروسے کو کس طرح نبایا! اس کا پتہ نیچے کی گھٹنا سے لگتا ہے، جسے راجیندر بابو نے اپنی 'آتم کتھا' میں اس طرح لکھا ہے:

"حق صاحب کے ساتھ ایک بہت غریب گھر کا لڑکا رہا کرتا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا تھا کہ لڑکا پڑھنے میں تیز ہے۔ اُنکے دل پر اس کا بھی اثر پڑا تھا کہ مسلمان ہو کر بھی اُس نے ہندی اور سنسکرت پڑھی تھی۔ وہ کالج کے فرسٹ ایر یا سکنڈ ایر میں پڑھتا تھا۔ نام تھا اس کا محمد خلیل۔ حق صاحب اُسے مانتے تھے۔ اسہیوگ آرمبھ ہونے پر اُس نے بھی کالج چھوڑ دیا اور حق صاحب کے ساتھ ہی اُنکی کوٹھی چھوڑ کر صداقت آشرم میں جاکر رہنے لگا۔ ایک ڈیڑھ سال بعد میں نے سُنا کہ حق صاحب نے اُس کو نکال دیا۔ محمد خلیل نے بھی آکر مجھ سے کہا کہ وہ رنج ہو گئے ہیں آپ سفارش کرکے انکو شانت کر دیجئے۔ حق صاحب کی مہربانی میرے اوپر برابر رہا کرتی تھی۔ وہ دل سے مجھے پیار کرتے تھے۔ اس لئے میں نے محمد خلیل کے بارے میں اُن سے کہا۔ اُس سمے تک محمد خلیل سارے بہار میں وکھیات (مشہور) ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اسہیوگ آرمبھ ہوتے ہی ایک راشٹریہ بھجن بنایا تھا، جو اُن دنوں بہت چالو ہو گیا تھا...۔ اُن دنوں شاید ہی کوئی ایسی سبھا ہوتی تھی، جس میں یہ گیت اُستاد سے نہ گایا جاتا ہو۔

"جب میں نے حق صاحب سے کہا کہ محمد خلیل کی کوئی غلطی ہو تو معاف کیجئے۔ تو انھوں نے بہت ہی دُکھ کے ساتھ مجھ سے کہا، "میں تمھاری بات کبھی نہیں ٹالتا، پر اس سمے مجبور ہوں۔ تم نہیں جانتے کہ خلیل نے کتنا بُرا کام کیا

ہے، اس لئے تم سفارش کر رہے ہو۔ میں نے جس چیز کو اپنے سارے جیون کا مکھیہ ادیش (خاص مقصد) بنا لیا ہے، جس کے لئے سب کچھ کرتا آیا ہوں اور آج فقیر بن گیا ہوں، اس پر اِس نے ٹھیس لگائی ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں ہندو مسلم ایکتا کے لئے کام کیا ہے، اسی میں آج بھی لگا ہوا ہوں۔ آشرم میں رہ کر اس نے ہندو لڑکوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا ہے، جس سے وہ لڑکے، جو مجھ پر وشواس کرکے پریم وش میرے پاس آگئے ہیں، ہندو مسلم بھید بھاؤ سمجھنے لگے۔ اس نے میرے سارے جیون کے سپنے بنائے کام کو بگاڑنے کا جتن کیا ہے۔ اس نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ لڑکوں کو مسلمان بنا دے۔ میں سب کچھ معاف کر سکتا ہوں، پر اس طرح اسلام کے نام پر لڑکوں کے ساتھ وشواس گھات کرنا برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں جان گیا ہوں کہ اِس نے ہندی اور سنسکرت بھی اسی ڈھونگ کیلئے پڑھی ہے۔ ایک دن یہ ہندو مسلم فساد بھی کرا دیگا۔ میں اِسے آشرم میں ہرگز نہیں رہنے دوں گا۔"

اس طرح انھوں نے اس محمد خلیل کو، جسے انھوں نے اپنے بیٹے کی طرح پالا پوسا تھا اور جس کی پڑھائی لکھائی میں ہزاروں روپیہ خرچ کیا تھا، اس الزام پر کہ اس نے کسی ہندو لڑکے کو مسلمان ہونے کے لئے پھسلایا تھا، اس طرح گھر سے نکال دیا کہ پھر زندگی بھر اس کا منہ نہیں دیکھا۔ صرف اسی ایک گھٹنا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ہندو مسلم ایکتا پر کتنی سچائی سے یقین کرتے تھے اور اسے کتنی اہمیت دیتے تھے۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ گاندھی جی کی ہی طرح مولانا بھی کبھی یہ نہیں دیکھتے تھے کہ آگے ان بھاؤناؤں کا ہندوؤں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اُن کے نزدیک ہندو مسلم ایکتا کا کام دوکانداری نہیں تھی، جس کا عوض کچھ نہ کچھ ملنا ہی چاہیے۔ بلکہ یہ تو اُن کا ایمان تھا اس لیے جب فرقہ پرست ہندوؤں نے مولانا مظہر الحق صاحب کا بھی ہندو مسلم سوال کی آڑ لیکر، طرح طرح سے ورودھ کیا اور اُن کا اپمان کیا، تب بھی اُن کے دل میں کوئی کڑواہٹ نہیں آئی اور نہ اُن کو کچھ اور لیڈروں کی طرح اپنے خیالات بدلنے کی ہی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانا جانتے تھے کہ جن کی دوکانداری ہی فرقہ پرستی پر چلتی ہے، اُن سے اس کے سوا کسی دوسرے برتاؤ کی امید کی ہی نہیں جا سکتی۔

اسہیوگ کے دنوں میں اور اس کے بعد مولانا بہت دنوں تک بہار ودیا پیٹھ کے چانسلر رہے۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے مدرلینڈ نام کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا، جس میں ایک لیکھ نکالنے کے جرم میں اُن کو سزا بھی بھگتنی پڑی۔ کچھ دنوں بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ اس کے بعد وہ چھپرا ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین بھی چنے گئے ان دنوں ہی یعنی سنہ ۱۹۲۶ میں جب ہندستان کے دوسرے دوسرے صوبوں کی طرح بہار کے ہندو مسلمانوں کے بیچ کھینچا تانی شروع ہوئی، تو مظہر الحق صاحب نے چھپرا میں ہی بہار کے سبھی خاص خاص نیتاؤں کو اکٹھا کیا اور اُن سے آپس میں ایکتا بنائے رکھنے کی اپیل کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہار میں اُس

گرما گرمی اور جوش و خروش کے زمانے میں بھی ہندو مسلم ایکتا کا ایسا سندر کام ہوا کہ پورے دیش بھر میں اس کی چرچا رہی۔

اسی سال جب گوہاٹی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا، تو بہت سے صوبوں نے اُس اجلاس کی صدارت کے لئے مولانا مظہرالحق صاحب کا نام پیش کیا۔ لیکن مولانا نے اس عہدے کو، جو ہندستان میں سب سے بڑی عزت کی بات سمجھی جاتی رہی ہے، منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اُنھوں نے کانگریس کی صدارت منظور کر لی، تو اپنے صوبے میں وہ ہندو مسلم ایکتا کے لئے جو کام کر رہے ہیں، وہ نہیں کر سکیں گے۔ اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مولانا ایکتا کے کام کو کتنی ترجیح دیتے تھے۔

اس طرح سے مولانا مظہرالحق صاحب ایک ایسی ہستی تھے، جو فرقہ پرستی کے بڑے بڑے طوفانوں میں بھی شانت اور پریم کے گیت گاتے رہے۔ مسلمانوں نے اُنکو کافر کہا اور ہندوؤں نے اُن پر طرح طرح کے الزام لگائے، لیکن وہ اپنی جگہ پر ہمیشہ جمے رہے۔ سنہ ۱۹۲۹ میں جب لاہور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا، مولانا کا اپنے گاؤں فریدپور ضلع چھپرا میں انتقال ہو گیا۔ وہ بہت دن سے اپنے اس گاؤں میں آکر رہنے لگے تھے اور دن رات ایشور کی یاد اور مذہبی کتابوں میں ڈوبے رہ کر فقیروں جیسی زندگی بِتا رہے تھے۔ یہیں اُنھوں نے آم کا ایک بڑا باغ بھی لگایا تھا۔ انکے انتقال سے کچھ ہی دن پہلے اُنکے ایک جوان لڑکے کی موت بھی پاس کی ہی دا ہا ندی میں ڈوب جانے سے ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ بڑے اُداس رہنے لگے تھے۔

جیسا کہ راجیندر بابو نے لکھا ہے، سچ مچ مولانا کی موت سے ہندو مسلم ایکتا کا ایک سچا حامی اس دنیا سے چلا گیا۔ کاش مولانا آج ہوتے تو اس میں تو شک نہیں کہ زمانے کی حالت کو دیکھتے ہوئے انکو بڑا صدمہ پہنچتا، لیکن آج جو اِنے گِنے آدمی دیش میں ایکتا قائم کرنے کا کام کر رہے ہیں، انکے لئے وہ ایک بڑے سہارے کی چیز بن جاتے اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج اُن کا نام بھی ہمیں ایک نئی روشنی اور نیا اُتساہ دینے کی طاقت رکھتا ہے۔

مولانا محمد میاں منصور انصاری

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی طرح مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری بھی ولی اللہی سنگٹھن کے اُس اندولن سے تعلق رکھتے ہیں، جو ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے ۱۹۱۵ء کی پچھلی بڑی لڑائی کے وقت شروع کیا تھا اور سرکاری کاغذوں و رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں جس کو "سلکن لیٹرس کانسپریسی" یعنی "ریشمی خطوں کی سازش" کے انوکھے اور رنگین نام سے پکارا گیا ہے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس تحریک کا ہیرو مولانا محمد میاں صاحب کو ہی بتایا گیا ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب اس پرانے انقلابی سنگٹھن سے اپنے بچپن میں ہی مربجیت ہو چکے تھے کیوں کہ اس سنگٹھن کے پانچویں امام مولانا محمد قاسم صاحب اُن کے سگے نانا تھے۔ مشہور ہے کہ جب مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی بیٹی یعنی مولانا محمد میاں صاحب کی ماں کی شادی کی تھی تب اُن کے پاس شادی میں خرچ کرنے اور دہیز دینے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا نہ تو اُن کو کچھ بھی رنج تھا اور نہ اس سے اُن کو کوئی دقت ہی محسوس ہوئی۔ دہیز کے وقت اُنھوں نے اپنی کچھ کتابیں اپنی پیاری بیٹی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا تھا کہ میری دولت تو یہی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اگر تو اس کی

قدر کرے گی، تو تجھے سچ مچ اس دولت سے ہی سچا سکھ اور آرام نصیب ہوگا۔ بیٹی نے بھی بنا کسی ہچک کے اس نایاب دولت کو لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اپنے نانا اور اپنی ماں کی یہی بھاؤنائیں مولانا محمد میاں صاحب کو بھی وراثت میں ملیں جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ دنیاوی لالچوں سے بچے رہے اور دیش بھگتی کی راہ میں آنے والی تمام مصیبتیں خوشی خوشی جھیلتے رہے۔

مولانا محمد میاں صاحب کے پتا مولانا عبداللہ انصاری علی گڑھ یونیورسٹی میں مذہبی تعلیم کے محکمے کے ناظم تھے اور اس مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کا سلسلہ بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہونے والے مشہور صوفی فقیر شاہ ابوالمعالی سے ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ چاروں طرف تنگ دلی کا دور دورہ تھا اور اسلام کو اس شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، جس سے دوسرے مذہب کے لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے، تب شاہ ابوالمعالی نے اپنے اپدیشوں میں پریم اور محبت کی دھارا بہا کر اسلام کی بہت بڑی سیوا کی تھی۔ اسی طرح مولانا محمد میاں صاحب کو فرقہ وارانہ تنگ دلی کے خلاف لڑنے اور آپسی پریم کا پرچار کرنے کے جذبات بھی خاندانی وراثت میں ملے تھے۔

اپنے ملک کی غلامی اور انگریزی راج کی بربریت سے بھی مولانا منصور اپنے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی واقف ہو چکے

تھے ۱۸۵۷ء کی مشہور آزادی کی لڑائی میں اُن کے نانا مولانا قاسم صاحب نے کس طرح حصہ لیا تھا اور اُس کی وجہ سے اُن کو اور اُن کے خاندان کو کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھانی پڑی تھیں، سید حسن انصاری صاحب، جو ننھیال کے ناتے مولانا کے ایک قریبی بزرگ ہوتے تھے اور جن کی بادشاہ کے دربار میں بہت بڑی عزّت تھی، کس طرح انگریزوں کی گولیوں سے شہید ہوئے تھے۔ اِن کی کہانیاں مولانا کو بچپن سے ہی سننے کو ملی تھیں۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالا تو آپ دیوبند مدرسے میں مولانا محمود الحسن صاحب کے پاس پڑھنے کے لئے بھیج دیے گئے۔ رہی سہی کمی اب یہاں پوری ہوگئی اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے ولی اللّٰہی تحریک کے اصولوں اور اُس کے پچھلے اتہاس کو بھی پڑھا اور سمجھا۔ اس کے بعد آپ مولانا محمود الحسن کی انقلابی کونسل کے ایک خاص ممبر بنا لئے گئے اور ملک کی آزادی کے کام میں پورے زور شور سے حصہ لینے لگے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ میں لڑائی چھڑی اور مولانا محمود الحسن صاحب، اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں دوسرے ملکوں کی مدد لینے کے وچار سے مکّے کے لئے چلے تو مولانا محمد میاں صاحب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ یہ یاترا بھی ایسی انوکھی تھی، جس میں پگ پگ پر گرفتاری کا یا کسی بھی اور مصیبت کے آجانے کا خطرہ تھا، پر دیش بھکتوں کا یہ دَل کسی نہ کسی طرح ہندوستان سے نکل ہی گیا،

مکہ پہنچ کر مولانا محمود الحسن صاحب نے حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اور ہندستان کی اُتر پچھم کی سرحد پر بسنے والے آزاد قبیلوں کے نام ایک خط حاصل کیا جس کا ذکر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں "غالب نامہ" کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس خط میں آزاد قبیلوں کو ترکی کی حکومت کی طرف سے یہ یقین دلایا گیا تھا، کہ اگر وہ ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں مولانا محمود الحسن صاحب کو مدد دیں گے، تو ترکی کی سرکار اُن کی پوری پوری مدد کرے گی۔ اس خط کو حاصل کرنے کے بعد مولانا محمود الحسن صاحب اور اُن کے ساتھی مدینہ پہنچے، جس میں کہ وہ مدینہ کے گورنر بصری پاشا کی معرفت ترکی کے لڑائی کے محکمے کے وزیر انور پاشا سے بھی ملاقات کر کے اُن سے بھی آزاد قبیلوں کے لئے اسی طرح کا خط حاصل کر لیں۔ لیکن مدینہ پہنچنے پر کچھ ایسی اُلجھنیں پیدا ہو گئیں، جس سے معلوم ہوا کہ ابھی انور پاشا سے ملاقات ہونے میں کافی دن لگ سکتے ہیں۔ دوسری طرف حالت یہ تھی کہ مولانا محمود الحسن صاحب ہندستان چھوڑنے سے بہت پہلے ہی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کو کابل روانہ کر چکے تھے، جو وہاں پر مولانا کے حکم کا انتظار کر رہے تھے اس لئے فیصلہ یہ کیا گیا کہ فی الحال غالب پاشا کے خط کو ہی کسی شخص کے ذریعے آزاد قبیلوں میں پہنچا دیا جائے اور پھر اس کے بعد وہی شخص کابل پہنچ کر اس تمام کام کی رپورٹ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کو دے دے، جس سے وہ بھی اپنا کام شروع کر دیں۔

یہ فیصلہ تو کر لیا گیا، پر سوال یہ تھا کہ یہ کام سونپا کسے جائے؟ بہت دیر سوچنے وچارنے کے بعد آخر مولانا محمود الحسن صاحب نے فیصلہ کیا کہ یہ کام صرف مولانا محمد میاں صاحب ہی پورا کر سکتے ہیں۔ اُنھوں نے مولانا محمد میاں صاحب سے یہ بات کہی۔ اور مولانا نے خوشی خوشی اس کام کو پورا کرنے کا بار اپنے سر لے لیا۔ اس کام میں جو خطرے تھے۔ اُن سے محمد میاں صاحب بے خبر نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ہمارے ہی قافلے میں کچھ انگریزوں کے خفیہ بھی چل رہے ہیں۔ جو ہندستان کا کنارہ پڑنے سے پہلے ہی یہ تمام باتیں ہندستان کی حکومت تک پہنچا دیں گے، پھر بھی اُنھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اُس خط کو لے کر ہندستان چل دیے۔

مولانا محمد میاں صاحب غالب نامہ کے ساتھ ہندستان آگئے۔ انگریز حکومت کو بھی اس کی خبر لگ چکی تھی۔ اسلئے اُن کو پھانسنے کے لئے پورا جال بچھا لیا گیا تھا۔ پر مولانا نے ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ وہ تمام جال بچھا کا بچھا رہ گیا اور مولانا پورے ہندستان کو پار کر کے سرحد کے آزاد قبیلوں میں جا پہنچے۔ اتنا ہی نہیں، وہ راستے میں غالب نامہ کی بہت سی کاپیاں بھی بانٹتے گئے۔ جس سے ملک کے لوگ بھی جان جائیں کہ ہندستان کی آزادی کے لئے اس طرح کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ بھی اُس موقع کے لئے ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔

"غالب نامہ" لے کر مولانا محمد میاں صاحب (حاجی فضل

واحد صاحب (حاجی ترنگ زئی) کے پاس پہنچے۔ اُن کے سامنے اپنی پوری اسکیم رکھی۔ حاجی فضل واحد صاحب اِس اسکیم کی بہت سی باتیں تو پہلے سے ہی جانتے تھے، کیوں کہ وہ ۱۹۰۹ء سے ہی دیو بند مدرسے اور مولانا محمود الحسن صاحب سے اپنا تعلق قائم کر چکے تھے۔ اسی لئے اُنھوں نے انگریزوں کے ساتھ سرحد پر لڑائی بھی شروع کر دی تھی۔ 'غالب نامہ' پانے کے بعد حاجی فضل واحد صاحب نے اور بھی زور شور سے اپنی فوجوں کی بھرتی شروع کر دی اور اس میں اُن کو کامیابی بھی کافی ہوئی۔ مولانا محمد میاں صاحب نے بھی حاجی صاحب کے کام میں بہت بڑی مدد کی اور کئی لڑائیوں میں بھی حصّہ لیا، لیکن اس کے بعد وہ کابل کے لئے چل دئیے، کیوں کہ کابل کے شاہ امیر حبیب اللہ صاحب کے نام بھی اُن کے پاس کچھ خط تھے، جو اُن کو امیر تک پہنچانے تھے اور جن کے سہارے اُن کو اُمید تھی کہ کابل کی سرکار سے وہ کافی مدد حاصل کر لیں گے۔

مولانا محمد میاں صاحب نے کابل پہنچ کر امیر حبیب اللہ صاحب کے پاس وہ خط پہنچا دئیے۔ اور مولانا عبید اللہ صاحب کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ مولانا عبید اللہ نے کچھ ہی دن بعد جب ہندستان کی پہلی عارضی حکومت بنائی، تو مولانا محمد میاں صاحب نے اُس میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ یہ حکومت اس لئے بنائی گئی تھی جس سے اُس کے ذریعے ترکی، افغانستان اور جرمنی سے مدد لے کر ہندستان میں انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی شروع

کردی جائے۔ لیکن امیر حبیب اللہ نے اس کام میں کوئی مدد نہیں کی، اس لئے یہ حکومت کوئی خاص کام نہیں کر سکی۔ مولانا محمد میاں صاحب کے دل کو اس سے اتنا دھکا لگا اور امیر حبیب اللہ کے وہ اتنے زیادہ خلاف ہو گئے کہ کابل کا جو سنگٹھن امیر کو تخت سے اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا اُس میں اُنھوں نے کھلے عام حصہ لینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر اُن سے ناراض ہو گئے اور جب انگریزوں نے محمد میاں صاحب کو گرفتار کرنے کی اجازت امیر سے مانگی، تو امیر نے اُن کو فوراً اجازت دے دی۔ لیکن امیر حبیب اللہ کے چھوٹے بھائی نصر اللہ خاں صاحب بھی، جو افغانستان کے سب سے بڑے وزیر تھے اور امیر کی انگریز پرستی سے تنگ آکر اُن کو گدی سے الگ کر دینا چاہتے تھے، مولانا محمد میاں صاحب کے حامی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حکم کی خبر جیسے ہی نصر اللہ خاں کو ملی اُنھوں نے اپنی موٹر کے ذریعے مولانا محمد میاں صاحب کو چپ چاپ افغانستان کے اُتری پہاڑوں میں پہنچا دیا اور انگریز لاکھ سر پٹکنے پر بھی مولانا کو گرفتار نہ کر سکے۔

افغانستان کے اُتری پہاڑوں سے ۲۲ دن تک پیدل چل کر مولانا بخارا کی حد میں پہنچے اور ایک دن سرحدی پہرے داروں کی آنکھیں بچا کر چپ چاپ بخارا میں داخل ہو گئے اس کے کچھ ہی دن بعد جب امیر حبیب اللہ قتل کر دیے گئے اور امان اللہ خاں کابل کے تخت پر بیٹھے، تب مولانا محمد میاں صاحب کو کابل کی اس نئی حکومت نے کابل واپس

بلا لیا۔ مولانا خوشی خوشی کابل واپس آ گئے اور افغانستان کے راج کاج کو چلانے میں امیر امان اللہ خان کی مدد کرنے لگے لیکن اپنے دیش کی آزادی کو وہ نہیں بھول سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں میں امان اللہ خان نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ مولانا محمد میاں صاحب اور مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کی صلاح سے کیا گیا تھا اور سرحد کا وہ پورا علاقہ جس کی کمان حاجی ترنگ زئی کے ہاتھ میں تھی، اس وقت بھی افغانستان کی پوری مدد کر رہا تھا۔ لیکن ہوائی جہاز وغیرہ نہ ہونے سے افغان فوجیں زیادہ آگے نہ بڑھ سکیں اور افغانستان اپنی مکمل آزادی منظور کرا کر واپس لوٹ گیا۔ اس طرح مولانا کو ایک بار پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس پر بھی وہ ہمت ہار کر بیٹھ نہیں گئے اور انھوں نے اپنے کام کو جاری رکھنے کا ہی فیصلہ کیا۔

افغانستان کی یہ لڑائی ختم ہونے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل چھوڑ کر چلا جانا پڑا۔ مولانا محمد میاں صاحب کے لئے یہ بھی ایک بہت بڑا صدمہ تھا کیوں کہ پچھلے دسیوں برسوں سے دونوں ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر دیش کی آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ مصیبتوں سے بھری ہوئی نہ جانے کتنی گھڑیاں دونوں نے ساتھ ساتھ بتائی تھیں اور جب کہ ناکامیابی اور نراشا نے ان کے دلوں پر چوٹ کی تھی تو انھوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی تھی۔ لیکن آج رخصت کرانے اُن

لوٹنے کے دروازے اُن کے لئے بند ہو چکے تھے۔ تب وہ قریب قریب ہمیشہ کے لئے ہی بچھڑ رہے تھے۔ پر دیش بھکتوں کی راہ میں کیا نہیں سہنا پڑتا۔ مولانا نے یہ بھی سہا اور ایک دن اپنے دل پہ پتھر رکھ کر اپنے اس پیارے دوست کو وداع کر آئے۔

اس کے بعد مولانا محمد میاں صاحب انقورا میں افغان دوتاواس کے ایک بڑے افسر بنا کر بھیجے گئے۔ وہاں آپ نے کافی دنوں تک کام کیا۔ لیکن ایک دن آپ اپنے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ روس کے جنگلوں میں گرفتار کر لئے گئے۔ وہاں آپ کو قریب تین مہینے تک تاشقند کے جیل خانے میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد آپ کا مقدمہ چلا جس میں آپ کو پھانسی کی سزا سنادی گئی، لیکن تاشقند کے ایک بڑے افسر سردار عبدالرسول پر آپ کی شخصیت کا اتنا اثر پڑا کہ اس نے آپ کی رہائی کے لئے پوری طرح کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ رہا کر دئے گئے۔ اس طرح آپ ایک بار پھر پھانسی کے تختے پر چڑھتے چڑھتے بچے۔

تاشقند کی جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ افغانستان واپس لوٹے۔ لیکن جلدی ہی ایک راجنتک مشن پہ افغان سرکار نے آپ کو روس بھیج دیا، جہاں آپ لینن وغیرہ روس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں سے ملے۔ اس کے بعد آپ الفوزہ کے افغان دوتاواس میں سب سے بڑے افسر بنا کر بھیجے گئے۔ اس زمانے میں سمرنا کی فتح پر الفوزہ میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں آپ نے افغانی سفیر (دوت) کی حیثیت سے تقریر کی تھی۔

اسی زمانے میں آپ کاظم گری بقر پاشا، جمال پاشا، رؤف بے اور علی فتکری بے وغیرہ ترکی کے بڑے بڑے نیتاؤں کے سمپرک میں آئے اتفاق سے یہ سبھی نیتا اُس پارٹی کے تھے، جو مصطفےٰ کمال کے خلاف تھی، اس لئے مصطفےٰ کمال سے آپ کی کبھی نہیں نبھ سکی۔

انقورہ سے واپس آنے کے بعد آپ کچھ دنوں تک افغانستان کے سیاسی محکمے میں ایک بڑے افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور پھر اُس کے بعد آپ کو ایجوکیشن کے محکمے میں ڈائرکٹر کا عہدہ دیا گیا، جس پر آپ اُس زمانے تک رہے جب تک افغانستان کے تخت پر امان اللہ خاں رہے۔ لیکن اس کے بعد ہی افغانستان میں ایک طوفان اٹھا اور بچہ سقہ نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ انگریزوں کی پالیسی کیا کیا کرسکتی ہے، اُس کا وہ ایک حیرت میں ڈال دینے والا نمونہ تھا، جب کہ ایک معمولی ڈاکو کابل کے تخت پر بادشاہ کی حیثیت سے بیٹھ کر حکومت کر رہا تھا۔ بچہ سقہ چاہتا تھا کہ اُسے کچھ ایسے لوگ مل جائیں جن کا نام لوگوں پر اثر ہو اور جن میں راج کاج چلانے کی بھی قابلیت ہو۔ اس لیے اُس نے مولانا محمد میاں صاحب کو افغان پارلیمنٹ کا پریسیڈنٹ بنانا چاہا، لیکن محمد میاں صاحب جانتے تھے کہ بچہ سقہ کی کسی بھی طرح کی مدد کرنا انگریزوں کو مدد دینا ہے۔ اس لیے اُنھوں نے پریسیڈنٹ بننا نامنظور کردیا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ یعنی مولانا گرفتار کرلیے گئے اور اُن کو پھانسی کا حکم سنا

دیا گیا ایک بار پھر مولانا کے سر پر پھانسی کا رسّا جھولنے لگا، لیکن مولانا ایسی آسانی سے پھانسی پر چڑھ جانے والے جیو ہوتے، تو ابھی تک نہ جانے کتنی بار پھانسی پر چڑھ چکے ہوتے۔ اُنھوں نے ایک بار پھر جُگت لگائی، پہرے داروں کو ملایا اور ایک رات کو چپ چاپ قید خانے کی دیوار لانگھ کر سرحدی علاقے کی طرف چل دیئے، کیوں کہ اس علاقے میں آپ کی پُرانی جان پہچان تھی۔ چھپتے چھپاتے آپ باجوڑ آپہنچے اور وہاں تب تک رہے، جب تک بچّہ سقّہ کی حکومت بالکل ہی ختم نہ ہوگئی۔ اس کے بعد آپ پھر کابل لوٹ گئے۔

اس طرح ہمارے دیش کے اس دیش بھگت سپوت نے اپنے دیش کی سیاست کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

نہ جانے کتنے بڑے بڑے انقلاب اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں جب عرب میں آزادی کی لڑائی چل رہی تھی تب آپ عرب میں تھے۔ اس کے بعد جب افغانستان میں انگریزوں کے اثر اور اُن کے ادھیکاریوں کے خلاف انقلاب اُٹھا، تو اُس میں آپ نے خاص حصّہ لیا اور مصیبتیں جھیلیں۔ پھر جب بخارا میں کرانتی کی آگ سُلگی، تو آپ وہیں تھے۔ روس کی مشہور لال کرانتی کے وقت آپ تاشقند، ماسکو، باکو، باطوم اور طفلس میں گھوم رہے تھے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں جب ترکی سے خلافت ہٹی اور ترکی کا نیا جنم ہوا، تو آپ وہاں موجود تھے۔

اسی طرح نہ جانے کتنے ملکوں کے کرانتی کاری نیتاؤں سے بھی آپ کے تعلقات تھے۔ ٹرپولی ٹینیا کے مشہور کرانتی کاری نیتا شیخ

احمد سنوسی، مصر کی آزادی کی لڑائی کے ہیرو علامہ عبدالعزیز عویشی اور کردستان کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دینے والے شیخ محمود سعید کردی آپ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ اسی طرح ہندستان کے بیسیوں جلاوطن دیش بھگتوں کو آپ سے مدد ملتی رہتی تھی۔ مثال کے لئے جب آپ انقرہ کے دوران میں تھے، تب مولانا عبدالحنان صاحب امرتسری اور مولانا مولا بخش صاحب نگینوی مہینوں تک آپ کے مہمان رہے۔ اصل بات یہ تھی کہ کوئی بھی ایسا شخص، جو دیش بھگت ہو آپ کے لئے سگے بھائی کی طرح پیارا ہو جاتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں جب ہندستان کے صوبوں میں کانگریس سرکاریں بنیں تب آپ سے بھی کہا گیا کہ آپ برٹش حکومت سے ہندستان لوٹنے کی اجازت مانگیں، لیکن آپ کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ جس حکومت سے آپ زندگی بھر لڑتے رہے، اُسی کے سامنے اب کچھ رعایتوں کے لئے ہاتھ پھیلائیں۔ نہ آپ اُس ہندستان میں لوٹنے کے لئے ہی تیار تھے جس کی سرکاری عمارتوں پر اب بھی یونین جیک لہرا رہا تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ میں تو اُسی ہندستان میں لوٹوں گا، جو پوری طرح آزاد ہوگا۔

لیکن مولانا کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو سکا اور ۱۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو اپنے وطن کی آزادی کی مالا جپتے جپتے وہ ہمیشہ کے لئے اس دُنیا سے چل دیئے۔

کون جانتا ہے کہ جب اُن کی پلکیں ہمیشہ کے لئے مُوند رہی ہوں گی، تب اُن کے دل میں کیا کیا ارمان اُٹھ رہے تھے۔ شاید ایک

بار تو اُن کو اپنے وطن کی یاد آئی ہی ہوگی۔ جس کے لئے اُنھوں نے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا تھا اور جس سے وہ پچھلے تیس سال سے جُدا رہے تھے۔ پر اس کے ساتھ ہی اُن کے سامنے ہندستان میں چل رہے ہندو مسلمانوں کے وحشیانہ جھگڑوں کی تصویر بھی تو گھومی ہوگی اور تب شاید اُنکو اس سے تسلّی ہی ملی ہوگی کہ آج وہ ہندستان میں نہیں ہیں اور اپنے اس آخری وقت (میں) کم سے کم اُن کے کانوں میں، کسی مسلمان کے ہاتھوں مارے جانے والے کسی ہندو یا کسی ہندو کے ہاتھوں مارے جانے والے مسلمان کی بیوہ کی چیخ تو نہیں آرہی ہے۔

مولانا کا نام ہندستان کی آزادی کی لڑائی کے اتہاس میں ہمیشہ امر رہے گا۔

بریگیڈیر محمد عثمان

(بھائی اکشے کمار جین)

[بریگیڈیر محمد عثمان یوں اپنی نوکری کا فرض ادا کرتے ہوئے مارے گئے تھے، لیکن فرقہ پرستی کے اُس طوفان کے زمانے میں، یہ کون نہیں جانتا کہ فوج اور پولیس کے دماغ میں بڑے زہریلے ہو چلے تھے. بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ دونوں طرف اگر پولیس اور فوج ایمانداری سے اپنا فرض ادا کرتی رہتی اور مار کاٹ میں خود حصہ نہ لیتی تو جتنی خون خرابی بھی ہوئی اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوئی ہوتی۔ ایسے زمانے میں بھی بریگیڈیر محمد عثمان کس طرح سچائی کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتے رہے اور اسی میں شہید ہو گئے، اسکا حال پاٹھک اس لیکھ میں پڑھیں گے۔

اس لیکھ کے لیکھک بھائی اکشے کمار جین جس اخبار کے آفس میں کام کرتے ہیں اُسی میں بریگیڈیر عثمان کے بھائی محمد سبحان صاحب بھی کام کرتے تھے۔ لہذا بریگیڈیر عثمان کے بارے میں لیکھک نے جو باتیں دی ہیں، وہ گہری چھان بین کے بعد ہی دی ہیں۔ ہندستان ہمیشہ اس شہید پر ناز کرتا رہے گا۔

— مبارک]

بھارت نے اس زمانے میں جو اِنے گنے بہادر نوجوان پیدا کئے ہیں، اُن میں بریگیڈیر عثمان کا استھان بہت اونچا ہے۔ نوشہرہ کے اِس بہادر وجیٔ کا نام آزاد ہندستان کی تاریخ کے آکاش میں ہمیشہ چندرماں کی طرح چمکتا رہے گا۔

محمد عثمان کا جنم یو۔پی کے اعظم گڑھ ضلع میں بی بی پور گاؤں میں ہوا تھا۔ بنارس کے ہریشچندر ہائی اسکول سے اُنھوں نے انٹرنس پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان دیا۔ اپنی پڑھائی کے زمانے میں ہی عثمان صاحب کو کھیل کود میں بھاری دلچسپی تھی اور وہ یونیورسٹی کے اسپورٹ چمپین تھے۔ اُسی زمانے سے وہ راج نیتی میں دلچسپی رکھتے تھے اور الہ آباد یونیورسٹی یونین کے وہ بہت دنوں تک سکریٹری بھی رہے تھے۔

الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد وہ دہرہ دون کے فوجی کالج میں جانا چاہتے تھے، لیکن اس کالج میں زیادہ تر ایسے لوگ ہی لے جاتے تھے جو کسی راجہ، نواب یا بڑے فوجی افسر کے خاندان کے ہوں۔ عثمان صاحب سے یہ پابندی ہٹالی گئی اور اُن کو کالج میں داخل کرلیا گیا۔ اس کالج کے ودّیارتھیوں کے لئے یہ ضروری سا ہی تھا کہ وہ اپنے انگریز افسروں جیسی پوشاک میں رہیں، اُن کا جیسا ہی کھان پان (جس میں شراب خاصی ماترا میں ہوتی تھی) اپنا بھی رکھیں۔ لیکن عثمان صاحب نے یہ باتیں نہیں اپنائیں۔ وہ اُس فوجی کالج میں بھی معمولی وقت میں کھدر کا کرتا، پاجامہ پہنتے تھے، مسلمان ہو کر بھی وہ گوشت نہیں کھاتے تھے، کیونکہ

گوشت کھانا شریعت کے لحاظ سے ہر ایک مسلمان کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ہاں، اگر وہ چاہے تو کھا سکتا ہے۔ ایک اچھے مسلمان اور ساتھ ہی نیک انسان ہونے کی وجہ سے شراب تو اُنھوں نے کبھی چکھی تک نہیں۔ دہرہ دون کے فوجی کالج میں پڑھنے والے کسی ودیارتھی کے لیے اُس زمانے میں شراب سے بچا رہنا کتنے اونچے کیریکٹر کی نشانی تھی، اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جو اُس کالج کی اُس زمانے کی حالت سے واقف ہیں۔ لیکن عثمان صاحب کی نیک چلنی کی یہیں تک حد نہیں تھی، وہ تو سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے اور نیم سے چرخہ چلاتے تھے اپنے ان نیموں کا پالن اُنھوں نے بعد کی زندگی میں بھی کیا۔ یہاں تک کہ محاذ پر بھی اُنکے خیمے میں گاندھی جی کی تصویر اور چرخہ دیکھنے میں آتا تھا۔

اگست سنہ ۱۹۲۳ میں عثمان صاحب کو کمیشن ملا اور سنہ ۱۹۳۵ میں وہ پہلی بار لڑائی کے میدان میں پہنچے۔ سنہ ۱۹۴۱ تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ رہے۔ بعد کو کچھ وقت کے لیے پشاور میں کپتان بھی رہے۔ کوئٹہ کے اسٹاف کالج سے امتحان دینے کے بعد آپ عراق اور برما بھیجے گئے۔ برما میں کچھ دنوں تک اُنھوں نے ایک رجمنٹ کی کمان بھی کی تھی۔

اس کے بعد ہوائی سینا میں کام کرنے کی غرض سے پیراشوٹ سے اُترنے کی ٹریننگ لینے کے لیے انگلینڈ گئے اور وہاں اُن کو اس ٹریننگ میں کافی اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔

عثمان میں انسانیت کا جذبہ

اس طرح بریگیڈیر عثمان ایک ایسی تازگی اور طاقت کا خزانہ تھے کہ وہ بالکل مختلف ماحول میں بھی اپنے اصولوں اور آدرشوں پر کامیابی کے ساتھ چل لیتے تھے یہی وجہ تھی کہ فوجی زندگی اپنانے کے بعد بھی اُن کا دل ایک شاعر کے دل کی طرح لچکیلا اور دیا، ممتا سے ہمیشہ بھرا پُرا رہا۔ انکے مزاج کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے صرف دو مثالیں کافی ہونگی۔ جن میں سے پہلی مدراس صوبہ کے ایک گاؤں کی ہے۔ ایک دن اپنی فوجی جیپ میں عثمان صاحب ایک گاؤں کے پاس ہوکر گذرے۔ یکایک انھوں نے دیکھا کہ ایک عورت ایک کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی بلک رہی ہے۔ تھوڑے سے آدمیوں کی ایک بھیڑ بھی وہاں جمع تھی، جن میں سبھی کے چہروں پر بے بسی اور دکھ کی جھلک تھی۔ جیپ روک کر عثمان صاحب نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس عورت کا بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔ سنتے ہی عثمان صاحب بجلی جیسی تیزی سے ایک رسّی کے سہارے کنوئیں میں اُتر گئے، اور اُس عورت کے بچے کو نکالکر اُس کی ماں کے حوالے کردیا۔ اپنے بچے کو پھر اپنی گود میں پاکر ماں کے چہرے پر جو خوشی تھی، عثمان صاحب کے لئے اُن کی محنت کا وہی سب سے بڑا عوض تھا۔

اسی طرح کی ایک دوسری مثال رانی کھیت چھاؤنی کی ہے۔ ایک دن شام کو عثمان صاحب کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک دیہاتی

نے اُن کو روتے ہوئے بتایا کہ پاس کے گاؤں میں ایک چیتا کئی آدمیوں کی جان لے چکا ہے۔ عثمان صاحب سب کچھ برداشت کر سکتے تھے پر انسان کی آنکھوں میں آنسو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے کھانا ویسے ہی چھوڑ دیا اور جب تک چیتے کو نہ مار لائے، دوبارہ کھانے پر نہ بیٹھے۔

راں کمیت کا وہ گاؤں آج بھی اُن کو بڑی عزت کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

فرقہ پرستی کے دشمن

بھلا مانو سماج کا اتنا بڑا اور سچا سیوک فرقہ پرستی کی گندگی میں سن ہی کیسے سکتا تھا! اسی لئے جب پنجاب میں فرقہ پرستی کا ننگا ناچ شروع ہوا اور 'ہندو سبھیتا' اور 'اسلامی تمدن' کو بچانے کے لئے دھرم اور دین کے دیوانے بچوں اور بوڑھوں کا قتل اور عورتوں کی بے عزتی کرنے لگے اور جب ہندو کے دل سے مسلمان کا اور مسلمان کے دل سے ہندو کا یقین بالکل ہی اٹھ چکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عام جنتا میں عام طور پر یہ شکایت تھی کہ فوج میں بھی فرقہ پرستی بُری طرح گھر کر گئی ہے، اس وقت بریگیڈیر عثمان کی یہ خود اعتمادی یعنی آتم وشواس تو دیکھئے کہ اُنھوں نے فوجی بٹوارے کے وقت اپنے مسلمان ساتھیوں میں اس بات کا پوری طرح پرچار کیا کہ وہ ہندوستان کی فوج میں ہی رہنے کا فیصلہ کریں۔ اپنے ساتھیوں میں بھی عثمان صاحب کا کتنا اثر تھا

وہ اسی سے ثابت ہے کہ قریب ڈھائی سو مسلمان افسروں نے اس زمانے میں، جب کہ ہر ایک کھاتا پیتا مسلمان، سوا کچھ نیشنلسٹوں کے، پہلی گاڑی سے پاکستان بھاگ جانے کے فراق میں تھا، ہندستان کی فوج میں رہنے کے فارم بھر دئے اور ہندستان کی سرکار نے بھی عثمان صاحب کی سچائی کو کتنی آسانی سے پہچان لیا تھا، اسکی مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پچھمی پنجاب میں گھرے ہوئے ہندو اور سکھوں کو نکالنے کا کام اُس نے بریگیڈیر عثمان کے ہی سپرد کیا۔ اپنے اس کام کو عثمان صاحب نے کتنی خوبی کے ساتھ پورا کیا، یہ تو اُس حلقے کے ہندو سکھوں سے پوچھئے، جن حلقوں میں عثمان صاحب رہے خاص طور پر وہ ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں اور جھنگ میں رہے اور وہ جب تک وہاں رہے، تب تک وہاں ایک ہندو یا سکھ کا بال بانکا بھی نہ ہو سکا۔ ملتان کے پچاس ہزار ہندو سکھوں کی اس کٹر مسلمان نے جس طرح حفاظت کی اُسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ہمیشہ اور کڑے سے کڑے وقتوں میں بھی مسلمانوں کے بجائے ہندو سکھوں کو بچانے میں زیادہ دلچسپی لی۔

اُن کے اس کام کو دیکھ کر ہی اُنکو گورداس پور ضلع کے تتر بتر بھٹیوں کو نکالنے کا کام سونپا گیا تھا اور وہاں امن قائم کرنے میں اُنھوں نے جو پھرتی دکھائی۔ اُسکی وجہ سے اُن کا نام ہندستان کی فوجی دنیا میں روشن ہو گیا۔

اس کے بعد اُنکو جموں صوبے کا کمانڈر بنا کر کشمیر بھیجا گیا اُس وقت کشمیر کی حالت بیحد ڈانواڈول تھی۔ ایک طرف تو

آزاد کشمیر سرکار اور پاکستان سرکار اس بات کا پرچار کر رہی تھی کہ ہندستانی فوج کشمیر میں گھس آئی تو کشمیر کے ایک مسلمان کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گی اور دوسری طرف کشمیر کے کچھ سرپھرے ہندو جن میں سے کچھ تو پاکستان کے ساتھ ملے ہوئے تھے، جموں اور اس کے آس پاس وہاں کی مسلمان جنتا کے خلاف کارروائی کر کے پاکستان کے اس پرچار کو سچ ثابت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے بہت سے فرقہ پرست سنگٹھن بھی کشمیری حملے کو ایک ہندو ریاست پر ایک مسلم دیش کا حملہ، کی شکل دینا چاہتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کشمیر کی ۹۰ فیصدی سے زیادہ جنتا، جو مسلمان ہے، پاکستان اور حملہ آوروں کے ساتھ ہمدردی رکھنے لگی۔ لیکن بریگیڈیئر عثمان کے اس مورچہ پر پہنچتے ہی نہ تو پاکستان پرچار چلا اور نہ ہندو فرقہ پرستوں کا مطلب پورا ہو سکا۔ اب یہ لڑائی کشمیری جنتا کی پاکستانی فاسسٹ شاہی کے خلاف اپنی آزادی کی لڑائی بن گئی ہے۔ جس کی کمان ایک نیک نام بہادر مسلمان کے ہاتھوں میں تھی۔ بریگیڈیئر عثمان نے پہنچتے پہنچتے جس طرح نوشہرہ پر قبضہ کر لیا اس کی کہانی ہندستانی فوج کے شاندار کارناموں کے اتہاس میں ہمیشہ امر رہے گی۔ حملہ آور قبائلی اور پاکستانی فوجوں کے دل میں تو عثمان کے نام کی اس طرح دہشت بیٹھ گئی تھی کہ ہر تیسرے دن عثمان صاحب کے مارے جانے کا اعلان آزاد کشمیر ریڈیو سے کیا جاتا تھا، جس سے کہ حملہ آوروں میں ہمت بنی رہے۔ بریگیڈیئر عثمان کو زندہ یا مرا ہوا پکڑ لانے کے لیے پچاس ہزار روپے کے انعام کا اعلان بھی حملہ آوروں کی طرف سے کیا گیا

گیا تھا۔ لیکن ہندستان کی بدقسمتی سے ۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو آل انڈیا ریڈیو کو یہ خبر بھی سنانی پڑی کہ ہندستان کا یہ بہادر سپوت، فرقہ پرستی کا یہ سب سے بڑا دشمن اور انسانیت کا یہ نیکنام سیوک ہندستانی فوج کی کمان کرتا ہوا کشمیر کے مورچے پر اپنی آخری نیند سوگیا۔ برگیڈیر عثمان کی یہ موت ایک ایسی موت تھی، جسکے لئے کسی بھی بہادر دیش بھکت کے دل میں ڈاہ پیدا ہوسکتی ہے۔ اور اُنکے کفن دفن کی رسم بھی ہندستان کی سرکار نے جس شان و شوکت سے پوری کی وہ اس بہادر کی ایک سچی عزت تھی۔ اُس دن سچ مچ پورا ہندستان خون کے آنسو رویا تھا اور اُس نے یہ محسوس کیا تھا کہ آج اُس کا ایک بہادر رکشک مارا گیا۔ لیکن کہتے شرم آتی ہے کہ ہندستان کے گنے گنے کچھ لوگوں، ایسے لوگوں نے، جن کے دل فرقہ پرستی کے زہر سے بھرے ہوئے ہیں عثمان صاحب کی شہادت سے پیدا ہونے والی اچھی فضا سے دہشت کھاکر اس بارے میں ایک گندہ پرچار کرنا بھی شروع کیا تھا۔ وہ پرچار ایسا بیہودہ تھا کہ مجھے اُسے لکھنا بھی گوارہ نہیں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہندستان کی جنتا چُپ چاپ ہونے والے اُس زہریلے پرچار کے بہکاوے میں نہیں آئی۔

برگیڈیر عثمان دنیاوی طریقے پر تو مرگئے لیکن وہ زندہ ہیں اور صدیوں تک زندہ رہیں گے۔ اپنے دیش کے لئے شہید ہوجانا ہی اُن کی سب سے بڑی خواہش تھی اور وہ خواہش پوری ہوگئی۔ پرماتما اپنے پیاروں

کی خواہش کا کتنا خیال رکھتا ہے، عثمان صاحب کی شہادت
سے یہ بات اچھی طرح روشن ہو جاتی
ہے۔



مسلم دیش بھگت

لیکھک
رتن لال بنسل فیروزآبادی